

بابری مسجد

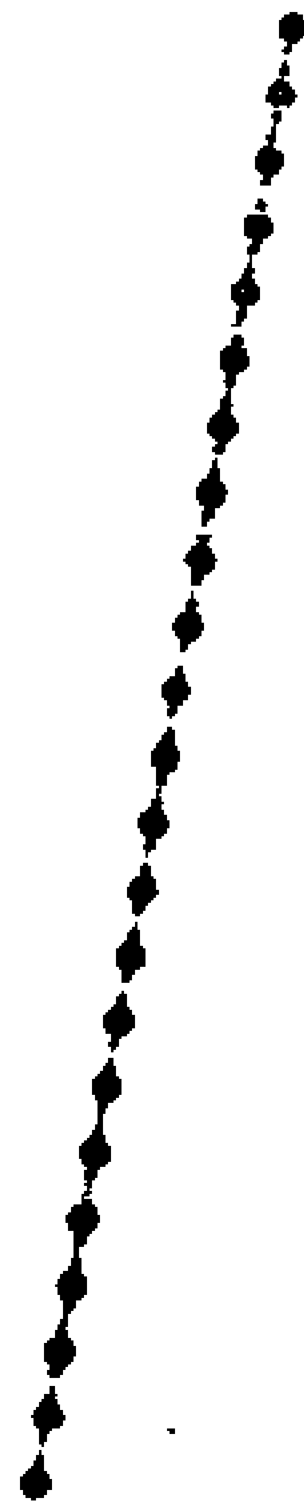
تاریخی پس منظر اور پیش منظر کی روشنی میں



شائع کردہ:

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

بابری مسجد



شائع کردہ

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (الہند)

انتساب

جذباتی ہم آہنگی، قومی یکجہتی اور وطن دوستی

کے

نام

سلسلہ نمبر :۱۶۷

نام کتاب: بابری مسجد
صفحات : ۱۷۶
ایڈیشن : طبع ہفتم ۲۰۱۲ء
مطبع : معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ، یوپی (ہند)
ناشر : دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ، یوپی (ہند)
قیمت : ۷۵؍روپئے
باہتمام : عبدالمنان ہلالی

ISBN : 978-93-80104-97-3

Darul Musannefin Shibli Academy,
Post Box No: 19, Shibli Road - Azamgarh
Email: shibli_academy@rediffmail.com
website: www.shibliacademy.org

فہرست مضامین

بابری مسجد

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
دیباچہ	۱۔۱۰	تبصرہ	۳۹
بابری مسجد کے کتبات	۱۱	مسجد کا رجسٹریشن ۱۸۶۰ء	۳۹
غاصبانہ قبضہ کی زمین پر مسجد کی تعمیر ناجائز	۱۴	۱۸۶۰ء کے مقدمہ کی ایک درخواست	۳۹
غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کے		تبصرہ	۴۱
ساتھ رسول اللہ ﷺ کی رواداری	۱۵	۱۸۶۰ء کے مقدمہ کی ایک رپورٹ	۴۱
بابر کی رواداری	۱۶	۱۸۶۱ء کے ایک حکم نامہ کی نقل	۴۲
ہندو مؤرخین کی شہادت	۱۷	تبصرہ	۴۲
بابر اور مندروں کا احترام	۱۷	۱۸۷۰ء، ۱۸۷۷ء کے مقدمہ کی	
بابر کی شخصیت پر ہندوؤں کا تبصرہ	۱۹	ایک درخواست	۴۳
آئین اکبری میں اجودھیا کا ذکر	۲۰	تبصرہ	۴۳
اجودھیا میں مسلمانوں کی آبادی	۲۱	پی. کارنیگی کی رپورٹ ۱۸۷۰ء	۴۴
قضیۂ نامرضیہ کا آغاز	۲۲	تبصرہ	۴۵
۱۸۵۸ء کے مقدمہ کی ایک درخواست	۳۷	الگزنڈر کننگھم کی رپورٹ جلد اول ۱۸۷۱	۴۸
مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ

مضمون	صفحہ
کننگھم کے بیان پر تبصرہ	۵۲
۱۸۷۷ء کا فیض آباد کا گزیٹیر	۵۳
تبصرہ	۵۶
۱۸۸۱ء کا امپیریل گزیٹیر	۵۹
تبصرہ	۶۲
۱۸۸۳ء کا مقدمہ	۶۲
تبصرہ	۶۳
۱۸۸۳ء کے مقدمہ کے ایک حکم نامہ	
کی نقل	۶۳
تبصرہ	۶۳
۱۸۸۴ء کا مقدمہ	۶۴
تبصرہ	۶۵
۱۸۸۵ء کے مقدمہ کی تفصیل	۶۵
تبصرہ	۶۷
فیض آباد کے سب جج پنڈت ہری	
کشن کا فیصلہ	۶۸
تبصرہ	۷۵
فیصلہ کے خلاف اپیل اور اس کی نامنظوری	۷۶
تبصرہ	۷۹
رام جنم استھان کا چبوترہ	۸۱

مضمون	صفحہ
۱۹۰۵ء کا فیض آباد گزیٹیر	۸۲
تبصرہ	۸۴
مسز اے۔ ایس۔ بیورج کی شرانگیزی	۸۶
اودھ میں بابر کا قیام	۸۸
انگریزوں کی شرانگیزی کا تجزیہ	۹۱
بابری مسجد کے لیے باضابطہ جاگیریں	۹۳
۱۹۳۴ء کا جھگڑا	۹۳
بابری مسجد کو مندر بنانے کی کوشش	۹۴
مسجد میں تالا	۹۴
۱۹۵۰ء کا مقدمہ	۹۵
شری اکشے برہمچاری کے دو خطوط	۹۵
شری اکشے برہمچاری کا میمورنڈم	۹۹
نقل میمورنڈم	۹۹
فیض آباد کے ایس۔ پی اور ڈپٹی	
کمشنر کی رپورٹیں	۱۰۷
جے۔ این۔ اوگرا ڈپٹی کمشنر فیض آباد	
کا تحریری بیان	۱۰۸
سول جج فیض آباد کا ۱۹۵۱ء کا فیصلہ	۱۰۹
تبصرہ	۱۱۳
۱۹۶۰ء کا فیض آباد گزیٹیر	۱۱۴

مضمون	صفحہ
تبصرہ	۱۱۷
یو. پی سنی سنٹرل وقف بورڈ کی طرف سے مقدمہ ۱۹۶۱ء	۱۱۹
مسجد میں تبدیلیاں	۱۱۹
بابری مسجد میں غیر قانونی تبدیلیاں	۱۱۹
رمیش چندر پانڈے کی درخواست	۱۲۰
فیض آباد کے ڈسٹرکٹ جج کے یہاں اپیل	۱۲۰
شری کے. ایم. پانڈے ڈسٹرکٹ جج فیض آباد کا فیصلہ یکم فروری ۱۹۸۶ء	۱۲۰
تبصرہ	۱۲۶
ہندوؤں میں خوشی اور مسلمانوں میں ماتم	۱۲۷
یو. پی کے مسلم ممبران اسمبلی کا میمورنڈم	۱۲۷
بعض ہندوؤں کی غیر دانشورانہ سرگرمیاں	۱۳۲
جناب سید شہاب الدین کی طرف سے مسلم مجلس مشاورت کا میمورنڈم	۱۳۷
وزیر اعظم کی خدمت میں مسلم ممبران پارلیمنٹ کا میمورنڈم	۱۴۲
احتجاجی مظاہرے	۱۵۱
ہندوؤں کی تنظیموں کے عزائم	۱۵۱
مسجد شکنی کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے	۱۵۱
مسلمانوں کی مذہبی رواداری	۱۵۶
مسلمانوں میں رامائن اور رام چندر کا احترام	۱۵۶
رام اور رامائن کے بعض ہندو نقاد	۱۵۹
ڈاکٹر شکلا کا ایک مضمون	۱۶۳
السٹریٹڈ ویکلی کا ایک مقالہ	۱۶۴
تتمہ	۱۶۷

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

فیض آباد مسلمانوں کا شہر سمجھا جاتا تھا، کیونکہ یہ نوابانِ اودھ کا دارالسلطنت کچھ دنوں تک رہا، اسی کا ایک حصہ اجودھیا ہے، اس سے بھی مسلمانوں کا عقیدت مندانہ لگاؤ رہا، کیونکہ ان کی روایت کے مطابق یہاں حضرت آدم علیہ السلام کے لڑکے حضرت شیث کی قبر ہے، جس کے بڑے احاطہ میں بہت سے بزرگانِ دین بھی مدفون ہیں، اس کی بھی شہرت ہے کہ حضرت نوحؑ، حضرت ہند بن نوحؑ اور حضرت ایوبؑ کی بھی قبریں ہیں، واللہ اعلم بالصواب، یہاں بخشی باباؒ، حضرت لعل شاہ بازقلند، جنگی شہید، الٰہی بخش مجذوبؒ، علم بخشؒ، شاہ مدار، سید جلال الدین خراسانی، شاہ شمن فریادرسؒ، حضرت جمال الدینؒ، شاہ ابراہیمؒ، شاہ چپؒ، قاضی قدوۃؒ، حضرت سلطان موسیٰ عاشقانؒ، حضرت شاہ علی اکبر میر کشاوی، بہادر شاہ، مکن شاہ، قطب شاہ، شاہ بدیع الدینؒ، حضرت جلال الدینؒ اور حضرت سید سالار مسعود غازیؒ کے شہید مجاہدین کی بھی قبریں ہیں، جن کی دیکھ بھال یہاں کے مسلمان بڑی عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں، یہاں اچھی اچھی مسجدیں بھی ہیں، مسجد سرگدواری تو اتنی اونچی ہے کہ کوسوں دور سے نظر آتی ہے، یہاں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مشہور خلیفہ حضرت

نصیر الدین چراغ اودھی ثم دہلویؒ کا خاندان بھی آباد ہوا، ۱۸۸۱ء کے امپیریل گزیٹر میں ڈبلو، ڈبلو ہنٹر نے اجودھیا کے ذکر میں لکھا تھا کہ یہاں چھتیس ۳۶ مسجدیں ہیں۔

یہ شہر بودھ مت کا بھی بڑا مرکز رہا، ایک روایت کے مطابق گوتم بدھ نے یہاں ۱۶ یا ۱۹ برس گذارے، ایک زمانہ میں یہاں بودھ مت کے بیس ۲۰ مندر تھے، اور تین ہزار بھکشو رہا کرتے تھے، اب یہ شہر بودھ مت کے آثار سے خالی ہو گیا ہے۔

یہ جین مت کے پانچ پیشواؤں کا بھی مولد اور مسکن رہا اور یہاں ان کے مندر بھی رہے، ہندو تو خاص طور پر اس کو پوتر سمجھتے ہیں کہ ان کی روایت کے مطابق یہیں رام چندر جی پیدا ہوئے، حکومت کی اور مرنے پر جلائے گئے۔

اجودھیا کی سرزمین میں شاید یہ کشش ہے کہ تمام مذاہب کے پیشوا یہاں کھنچ کر آتے رہے، اس کی اس اہمیت کو برقرار رکھنے کی خاطر اس کی مذہبی تاریخیت قائم رہنی چاہیے، اس کو صرف ایک مذہب سے وابستہ کر کے اس کی خصوصی عظمت کو ختم کرنا مناسب نہیں۔

اس کی اسی خصوصیت کی بنا پر یہاں جہاں اور مسجدیں تھیں، وہاں بابری مسجد کا بھی اضافہ ہوا، جس کو انگریزوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں اپنے سیاسی مفاد کی خاطر متنازع فیہ بنا دیا، اس کا قضیہ دبا ہوا تھا، مگر فروری ۱۹۸۶ء میں یکا یک پھر اٹھ کھڑا ہوا، راقم نے اس سلسلہ میں معارف کی پانچ اشاعتوں میں اس پر شذرات لکھے، جو پورے ہندوستان میں بہت دلچسپی سے پڑھے گئے اور ہر طرف سے اصرار ہوا کہ اس کو ایک کتابچہ کی صورت میں شائع کیا جائے، اخباروں اور رسالوں میں اس قضیہ پر معلومات فراہم ہوتے رہے، خیال ہوا کہ اس قضیہ کا مزید مطالعہ کر کے مستند اور مربوط معلومات ایک جگہ جمع کر دیے جائیں تو اس کو سمجھنے میں مدد بھی ملے گی اور بہت سی غلط فہمیاں بھی دور ہو جائیں گی، اسی خیال کی عملی کوشش اس کتابچہ میں نظر آئے گی، جو اس وقت ناظرین کے ہاتھوں میں ہے۔

۱۹۴۷ء سے پہلے پاکستان کی تحریک کے حامیوں نے یہ اثر ڈالا تھا کہ ہندو اور

مسلمان دو علاحدہ علاحدہ قومیں ہیں دونوں ایک قوم نہیں ہیں، اسی بنا پر ملک کی تقسیم ہوگئی، ۱۹۴۷ء کے بعد قومی یکجہتی، جذباتی ہم آہنگی اور متحدہ قومیت کا درس زور وشور سے پڑھایا گیا، اور یہ مؤثر بھی ہوتا نظر آیا، ۱۹۴۷ء سے اب تک بکثرت ہندو مسلمانوں کے درمیان خوں ریز اور تباہ کن بلوے ہوتے رہے لیکن ملکی پیمانے پر ان کے تعلقات ناخوشگوار نہیں ہوئے، شاید مسلمانوں کی تحقیر اور تذلیل کی خاطر کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن پاک کی طباعت و اشاعت کو ممنوع قرار دینے کی ایک درخواست بھی ایک انتہا پسند ہندو کی طرف سے پڑی، مگر ریاستی اور مرکزی حکومتوں کی غیر معمولی ہمدردی اور قانونی چارہ جوئی سے یہ معاملہ آگے نہیں بڑھا جس سے مسلمان دونوں حکومتوں کے ممنون ہوئے، پھر شاہ بانو کیس کے سلسلہ میں سپریم کورٹ میں مسلمان مطلقہ عورت کے نان نفقہ سے متعلق قرآنی احکام کے خلاف جو فیصلہ دیا گیا اس سے مسلمانوں میں غیر معمولی اشتعال پیدا ہوا لیکن پارلیمنٹ نے خیر سگالی اور خیر اندیشی کے جذبہ میں مسلمان مطلقہ عورت کا جو بل منظور کر لیا تو اس سے عام طور سے مسلمان خوش ہوئے، لیکن فروری ۱۹۸۶ء میں بابری مسجد کو مندر میں منتقل کر دینے کے عدالتی فیصلہ پر ہندو مسلمان میں جو غیر معمولی تناؤ پیدا ہو گیا ہے اس سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جذباتی ہم آہنگی، قومی یکجہتی اور متحدہ قومیت کا جو درس دونوں کو دیا گیا تھا وہ بالکل بھلا دیا گیا۔

خوشی کی بات ہے کہ بعض ہندو اہل قلم اور دانشوروں نے بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے قضیہ پر مفید مضامین لکھ کر انتہا پسند ہندوؤں کو اس کے متعلق ٹھنڈے دل سے سوچنے کی دعوت دی ہے، خود اتر پردیش کے وزیر پنڈت لوک پتی ترپاٹھی نے اخبار میں جو ایک لمبا بیان دیا ہے، اس کے بعض حصہ سے تو اتفاق نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن ان کا یہ بیان قابل توجہ ہے کہ جہاں تک میری معلومات ہیں اجودھیا کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، تلسی داس کی رامائن میں بتایا گیا کہ اجودھیا سرجو ندی میں ڈوب گیا تھا، آج کا اجودھیا اودھ کے نوابوں کا آباد کیا ہوا ہے، پنڈت لوک پتی ترپاٹھی نے یہ بھی کہا ہے کہ رام جنم بھومی کی تحریک

امریکہ میں شروع ہوئی، اس تحریک کے نتیجہ میں رتھ یاترا نکالی گئی، مجھے سو فیصدی یقین ہے کہ ہندو مسلم تعلقات کو بگاڑنے کے لئے سی۔آئے۔اے۔اجودھیا میں شرارت کر رہی ہے، ان کا یہ بھی بیان ہے کہ ہر قسم کے اشتعال اور جارحیت کے باوجود ہندوستانی مسلمان نہایت ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے مکمل طور پر پُر امن رہے لیکن وہ طاقتیں جو ہندو فرقہ پرستی کا جواز پیدا کرنا چاہتی ہیں اور ہندو مسلم ٹکراؤ کو گاؤں گاؤں، محلہ محلہ پھیلانا چاہتیں ہیں، وہ مسلمانوں میں بھی سرگرم ہوگئی ہیں۔ پٹنہ کے ایک ہندی ویکلی وچار بودھ میں ایک مضمون شایع ہوا جس سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اودھ کے ہندو مسلمان کو لڑانے کے لئے انگریزوں نے بابری مسجد اور رام بھومی کے تنازعہ کو جنم دیا، اسی مضمون میں بابر کے اس وصیت نامہ کا ذکر ہے جو اس نے ہمایوں کو دیا تھا، اس کو ہم اس کتابچہ کے اندر نقل کر چکے ہیں، مضمون نگار نے لکھا ہے کہ اس کی نقل قومی یادگار کے تحفظ کے محکمہ میں محفوظ ہے، اسی مضمون نگار نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ہمایوں نے باپ کے حکم کی پابندی کرتے ہوئے بنارس کے جگن ناتھ مٹھ کو ضلع مرزاپور میں تیرہ سو ایکڑ آراضی معافی میں دے دی، اس کا یہ حکم نامہ آج بھی جگن ناتھ مٹھ میں محفوظ ہے۔

پھر دہلی کے ڈاکٹر آر۔ایل۔شکلا اور السٹریٹڈ ویکلی کے مضمون نگار چیتانند داس گپتا نے جو اس سلسلہ میں مضامین لکھے ان کا تفصیلی ذکر اس کتابچہ کے اندر آیا ہے، پھر کچھ ہندو مسلمان دانشوروں کا ایک اجتماع انڈیا انٹرنیشنل سنٹر نئی دہلی میں ۷/جون ۱۹۸۶ء کو ہوا، اس میں بابری مسجد کے تنازعہ پر غور وخوض کیا گیا اور اس میں یہ طے کیا گیا کہ سماج کے تمام طبقات تشدد سے احتراز کریں، جذبات واحساسات میں بلندی پیدا کریں، ہوش مندی سے کام لیں اور یہ عہد کریں کہ ملک میں ایک سچا سیکولر اور ایسا جمہوری سیاسی ڈھانچہ مضبوط رہے جس میں سماج کا کوئی طبقہ اپنے آپ کو غیر محفوظ یا عدم توجہی کا شکار محسوس نہ کرے اور جہاں صحیح معنوں میں مساوات کا دور دورہ ہو۔

اس اپیل پر جن ہندوؤں نے دستخط کیے ان کے نام یہ ہیں: اندر کمار گجرال، راجندر سچر، ہرکشن سنگھ سرجیت، اوم پرکاش سری واتسو، دیوان بیرندر ناتھ، اریکموڈو راے۔ ایل سہگل، لفٹنٹ جنرل ایس اورا راجندر پوری، چندر شیکھر، بھائی ویدیہ، اے۔ ڈی گری، اندر موہن، اننت رام جیسوال، گووند نارائن، راجیشور راؤ، دھرم ویر سنہا، یشونت سنہا وغیرہ۔

ہم بھی مسلمانوں کی طرف سے یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ بابری مسجد، رام جنم بھومی توڑ کر اس کی جگہ پر بنائی گئی تو ایسی غاصبانہ قبضہ کی زمین پر جو مسجد بنائی گئی وہ مسمار کردیے جانے کے لائق ہے، اس میں نماز پڑھنے کا فتویٰ کوئی فقیہہ اور عالم نہیں دے سکتا، مگر یہ ثابت کرنے کے لئے مستند، معتبر اور معاصر ماخذوں کے حوالے چاہئیں، انگریزوں کے زمانہ کے لکھے ہوئے گزیٹیروں یا آثار قدیمہ کی رپورٹوں، یا سنی سنائی روایتوں کے حوالے قابل قبول نہیں ہوسکتے، ایسے مسلمان مصنفوں کی تحریریں بھی قابل توجہ نہیں جو نفرت، جنگ وجدل اور اشتعال بھری فضا میں لکھی گئیں، یا انگریزوں کی پھیلائی ہوئی نفرت کے بعد قلم بند ہوتی رہیں، انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی غرض سے بار بار اس پر زور دیا کہ وہ تو جہاں جاتے ہیں، دوسروں کی عبادت گاہوں کو مسمار کردیتے ہیں، یہی ان کا مذہبی اصول رہا ہے، ان انگریزوں کو لکھتے وقت یہ خیال نہیں رہا کہ عیسائیت کی تاریخ دوسروں اور خصوصاً مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو برباد اور مسمار کرنے سے بھری پڑی ہے، سسلی میں مسلمانوں کی حکومت تقریباً ۲ سو سال رہی لیکن عیسائیوں کا اقتدار وہاں ہوا تو خود ایک عیسائی مؤرخ ایس۔ بی۔ اسکاٹ بڑے دکھ اور درد کے ساتھ لکھتا ہے کہ ”سسلی میں مسلمانوں کے ہزاروں محل اور مسجدیں تھیں، ان کی خوبصورتی، موزونیت اور شان مسلمانوں کے شہروں کے لئے مایۂ ناز تھیں، اب ایک بھی وہاں باقی نہیں، ان کو یا تو عوام کالانعام نے پامال کرڈالا، یا وہ کلیسا کے تعصب کی نذر ہوگئیں“۔ (اخبار الاندلس ج ۲ ص ۷۵)

اسپین میں مسلمان نے تقریباً آٹھ سو برس تک حکومت کی، اس کو خوبصورت مسجدوں سے آراستہ کیا، قرطبہ اور الحمراء کی شاندار مسجدیں دنیا میں فن تعمیرات کے لحاظ سے بہترین نمونے سمجھی جاتی ہیں، مگر عیسائیوں نے اسپین کی ہزاروں مسجدوں کو مسمار کر دیا، ان کی جگہوں پر کلیسا، یا مکانات بنا لئے صلیبی جنگ کے زمانہ میں یروشلم کی مسجدوں کو صلیبیوں نے جس طرح منہدم کیا اس کی بڑی طویل المناک داستان ہے، اٹھارہویں صدی کے وسط میں روسیوں نے ترکوں کے خلاف کریمیا میں جنگ کی تو ایک یوروپین مؤرخ ایڈورڈ کریسی کا بیان ہے کہ روسی فخر کرتے تھے، کہ اس حملہ میں انہوں نے ۶ ہزار مکانات اور ۳۸ مسجدیں جلا دیں۔

یہ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان فاتحوں اور لشکریوں نے کسی مندر کو بھی نقصان نہیں پہونچایا، ان کے ہاتھوں سے بعض مندر ضرور منہدم ہوئے، ان کا انہدام کس طرح ہوا، ذرا اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے، مسلمانوں کے دور حکومت میں ان کو تین قسم کے ہندوؤں سے سابقہ پڑا: (۱) حربی (۲) نیم حربی و نیم وفادار (۳) وفادار اور اطاعت گذار، حربی تو وہ ہندو تھے جو مسلمانوں سے زیادہ تر علاقائی حکومت کی خاطر برابر لڑتے رہے اور ان کو ملک بدر کرنے کی فکر میں رہے، جنگ و جدل میں ایسے حربی ہندوؤں کے علاقہ میں بعض مندر ضرور مسمار کیے گئے، ان کے مسمار کرنے میں کوئی مذہبی جذبہ نہ تھا، بلکہ اس میں جنگجویانہ جذبہ کارفرما رہتا تھا، ایسی مثالیں بھی ہیں کہ حربی ہندو غالب آئے تو مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو منہدم کرنے میں دریغ نہ کیا، زیر نظر کتابچہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں بھیم سنگھ نے گجرات میں سو مسجدوں کو جلا دیا، نیم حربی اور نیم وفادار ہندو وہ تھے، جو لڑائی میں ہارنے کے بعد صلح کا معاہدہ کر لیتے اور اطاعت گذار بن جاتے، مگر جب مسلمانوں کی حکومت کمزور ہوتی تو اپنی علاقائی حکومت قائم کرنے کے لئے لڑائی اور بغاوت پر آمادہ ہو جاتے اور بعض اوقات مندروں کو اپنی سرکشی اور بغاوت کا اڈا بنا

لیتے، مسلمان لشکری ان کی سرکشی کو دبانے میں ان کی ان عبادت گاہوں کو بھی نقصان پہونچا دیتے، یہ بات اب آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے جب کہ امرتسر میں سکھوں کے سورن مندر یعنی گولڈن ٹمپل میں حکومت کی فوج کشی ہوئی اور اس میں اکال تخت کو بالکل مسمار کر دیا گیا، حکومتِ ہند کی فوج کشی کی ضرورت یوں ہوئی کہ یہ دہشت پسندوں، شرانگریزوں اور حکومت ہند کے خلاف باغیوں کا مرکز بن گیا تھا اور وہاں بہت بڑی تعداد میں مہلک اسلحے جمع کر لیے گئے تھے، ان کی دہشت پسندی و شرانگریزی کو دبانے کے لئے فوج کشی لازم تھی، اسی طرح کی کارروائی مسلمان حکمراں بھی اپنے زمانہ میں باغیوں کے خلاف کرتے رہے، اگر سکھ یہ کہیں کہ حکومت ہند نے اپنی مذہبی تعصب اور عداوت میں اکال تخت کو مسمار کیا تو کیا یہ کہنا صحیح ہوگا؟ بالکل نہیں، مندروں کے خلاف اورنگ زیب کے فوجی اور سیاسی اقدام کو اسی عینک سے دیکھنے کی ضرورت ہے، ہندوؤں کی تیسری قسم اُن لوگوں کی تھی جو وفادار اور اطاعت گذار ہوئے تو ان کی عبادت گاہیں محفوظ رکھی گئیں، یہی وجہ ہے کہ آگرہ اور دہلی کے وفادار اور امن پسند ہندوؤں کے مندروں کے انہدام کا ذکر نہیں ملتا، بعض مندر ایسے بھی تھے جو فحاشی کے اڈے بن گئے تھے، خود ہندوؤں کے ایماء سے ایسے مندر منہدم کئے گئے۔

خود ہمارے برادران وطن کو بھی سوچنا ہے کہ سیکڑوں برس کی گئی گذری باتوں کے انتقام کی آگ میں ملک کو جھلسا کر رکھ دینا کہاں تک وطن دوستی کا ثبوت دینا ہوگا، اگر یہاں کے لوگوں میں یہی انتقامی جذبہ پیدا ہوتا رہا تو پھر وہ صرف اسی کا جائزہ لیتے رہیں گے کہ وشنو مندر کے پجاریوں نے کتنے شیو مندروں کو منہدم کیا اور شیو مندروں کے حامیوں نے کتنے وشنو مندروں کو ڈھایا، یا ہندو مت کے پیروؤں نے بودھ مت کی کتنی عبادت گاہوں اور خانقاہوں کو مسمار کیا، یا بودھ مت والوں نے ہندوؤں کے کتنے مندروں کو برباد کیا، یا جین مت کے حامیوں نے ہندوؤں اور بودھوں کی کتنی پوتر جگہیں کو تہس نہس کیا اور خود ہندوؤں اور بودھوں نے جین مت کے کتنے مقدس مقامات کو برباد کیا، اگر ان کی تفصیلات

قلم بند کی جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی، یہ صحیح ہے کہ ہندوؤں نے ان مندروں کی فہرست تیار کر رکھی ہے جن کو مسلمانوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں توڑ پھوڑ کر ختم کیا لیکن مسلمانوں کی مستند کتابوں میں بھی یہ تفصیل موجود ہے کہ ہندوؤں نے خود مسلمانوں کے دور عروج میں کتنی مسجدیں شہید کیں، ۱۹۴۷ء کے بعد تو سرکاری رپورٹ کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ بے شمار مسجدوں سے مسلمان بے دخل کر دیے گئے، اگر ملک میں اقتصادی صنعتی اور تجارتی اسکیموں کے ماسٹر پلان بنانے کے بجائے ان ہی کی تفصیلات لکھی گئیں اور ان سے انتقامی جذبات ابھرے، تو پھر بھارت ورش میں انتقامی غیظ و غضب کی آگ کا صرف دریا ہی بہتا رہے گا، پھر یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ یہ ملک دوستی یا ملک دشمنی ہوگی، وطن دوستی تو اس میں ہے کہ یہاں کے لوگوں کے دلوں کو جوڑا جائے، نہ کہ توڑا جائے ایک دوسرے سے یگانگت، موانست اور محبت پیدا کی جائے، نہ کہ باہمی نفرت، عداوت اور خصومت کے شعلے فروزاں کیے جائیں:

ع جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتحِ زمانہ

یہ کتابچہ جس جذبہ سے لکھا گیا ہے، خدا کرے اسی جذبہ سے پڑھا جائے، بابری مسجد کے کتبات ہی سے ظاہر ہوگا کہ یہ مسجد محض عبادت کرنے کے لئے بنائی گئی، رام جنم بھومی مندر سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور ۱۵۲۸ء سے ۱۸۵۵ء تک یہ مسجد ہی رہی، پھر ۱۸۸۵ء کے مقدمہ میں بھی یہ مسجد تسلیم کی گئی، اس کا باضابطہ رجسٹریشن بھی مسجد ہی کی طرح ہوتا رہا، مگر جو اس کے قائل ہوتے گئے کہ اجودھیا صرف ہندوؤں ہی کی جگہ بن کر رہے اور ملک میں جس کی اکثریت ہے، اسی کی مرضی ہر معاملہ میں تسلیم کی جائے، وہی اس مسجد کو مندر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر تاریخ میں بعض غلطیاں ایسی بھی ہو جاتی ہیں جن سے غلطی کرنے والی قوم بے خبر رہتی ہے لیکن ان کے مضرت رساں اثرات صدیوں تک قائم رہتے ہیں۔

اس کتابچہ کی تیاری میں کلکتہ کا بھی سفر کرنا پڑا، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں الگزنڈر کننگھم کی رپورٹ اور ۱۸۷۰ء کے فیض آباد گزیٹیر سے استفادہ کیا، ان کے اقتباسات لینے میں کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر قمر الدین اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے مولوی عبدالخالق ندوی نے مدد پہنچا کر ممنون کیا، ۱۹۵۵ء بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل کے ایک شمارہ میں انڈولوجی کے بہت بڑے ماہر پروفیسر سنتی کمار چٹرجی نے ایک طویل مضمون میں رام چندر جی کے متعلق کچھ ایسی باتیں لکھی تھیں جن پر ان کی بڑی نکتہ چینی ہوئی کہ انہوں نے رامائن کے قصہ کو ہومر سے مستعار بتایا ہے، ان کی طرف سے جواب تھا کہ انہوں نے رامائن کو تو مستعار قصہ نہیں کہا لیکن ان کے نزدیک دس سروں والے راکشش کا وجود یونانی تخیل کی صدائے بازگشت ہے، کیوں کہ ہندوؤں کے قدیم ترین خرافاتی ادب میں ایسے راکشش کا ذکر نہیں ملتا، انہوں نے بعض بہت ہی پرانے شواہد سے اس پر بھی بحث کی کہ رام اور سیتا بھائی بہن تھے یا ازدواجی رشتہ میں منسلک تھے، اس سے بھی ایک علمی سنسنی پھیلی، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں اس شمارہ کو تو دیکھا مگر اس سے اقتباسات لینے کا وقت نہ ملا، کلکتہ کے قیام میں بابری مسجد ایکشن کمیٹی کی طرف سے بھی کچھ مفید لٹریچر حاصل ہوا۔

لکھنؤ سے محب عزیز جناب محی الدین نے ۱۹۰۵ء اور ۱۹۶۰ء کے فیض آباد گزیٹیر کے اقتباسات بھیج کر گراں بار کیا، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کے نگراں مولانا محمد مرتضیٰ صاحب نے حدیقۂ شہداء کا فوٹو اسٹیٹ اور قیصر التواریخ یا تواریخ اودھ کا نسخہ بھیج کر شکر گزار ہونے کا موقع دیا۔

اعظم گڑھ کے مشہور وکیل جناب شاہ غلام خالد نے مختلف مقدمات کی اصطلاحات کو درست کرنے میں مدد کی، اس کے لئے بھی ہم ان کے ممنون ہیں، اس کتابچہ کی تیاری میں انہوں نے ہر طرح ہمت افزائی کی۔

دارالمصنفین میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی، محمد مجید زبیری، مولوی عبید اللہ کوثی

ندوی، مولوی حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی، مولوی عبدالمبین ندوی، مولوی محمد عارف عمری، مولوی عبدالباری اور شاہ ظفر الیقین نے ہر طرح کی سہولتیں پہنچائیں، مولوی محمد عمیر الصدیق ندوی دریابادی نے بعض انگریزی اقتباسات کے ترجمے کر کے میرا کام ہلکا کیا، مولوی ابوالبقاء ندوی نے بعض مقدمات کے فیصلوں کے فوٹو اسٹیٹ لکھنؤ میں حاصل کیے، مولوی عبدالمبین نے بھی اس سلسلہ میں لکھنؤ کا سفر کیا۔

مسلم انڈیا مرتبہ جناب سید شہاب الدین ایم۔ پی کے مختلف شماروں سے بڑی مدد ملی، الحسنات اسلامی اردو ڈائجسٹ اور رسالہ دارالعلوم دیوبند سے بھی پورا استفادہ کیا گیا، ان رسالوں کے حوالے اس کتابچہ میں جابجا درج ہیں۔

پھر عرض ہے کہ اس کتابچہ کی ترتیب دینے میں بقائے باہمی، جذباتی ہم آہنگی اور وطن دوستی کے جذبات غالب رہے خدا کرے اس کے مطالعہ سے اچھے اثرات مترتب ہوں، یہ میری کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے، اس لئے اس کے ٹائٹل پر میرا نام نہیں ہے، اس میں صرف ہر قسم کے معلومات جمع کردیے گئے ہیں، اس لئے اس کی حیثیت محض ایک معلوماتی کتاب کی ہے، اس میں قضیہ سے متعلق مختلف قسم کے معلومات جمع کرنے میں تکرار بہت زیادہ پیدا ہوگئی، مگر یہ ناگزیر تھی۔

۱۵ر دسمبر ۱۹۸۶ء

سید صباح الدین عبدالرحمٰن
دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بابری مسجد

بابری مسجد کے کتبات: آج کل بابری مسجد کا قضیہ پورے ہندوستان میں اٹھ کھڑا ہوا ہے، اس مسجد کے متعلق ملک میں غور وفکر کی لہریں مختلف طریقوں سے بہہ رہی ہیں، پہلے اس کی تاریخی حیثیت پر غور کرنا ہے، اس کی تاریخی حیثیت تو اس کے کتبہ سے ظاہر ہوتی ہے، اس مسجد پر لکھے ہوئے کچھ اشعار تو یہ ہیں:

بفرمود شاہ بابر کہ عدلش — بنائیست تا کاخِ گردوں ملاقی
بنا کرد ایں مہبطِ قدسیاں را — امیر سعادت نشاں میر باقی
بود خیر باقی و سالِ بنائش — عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی

۹۳۵ھ

اس کا مطلب یہ ہے کہ شاہ بابر کے حکم سے جس کی عدل پروری کاخِ گردوں سے ملتی ہے، اس کی بنا پڑی، سعادت حاصل کرنے والے ایک امیر میر باقی نے اس کو بنوایا، جو ابِ فرشتوں کے اترنے کی جگہ ہے، خدا کرے یہ کار خیر باقی رہے، اسی لئے اس کی تعمیر کا سال ''بود خیر باقی'' ۹۳۵ھ ہے۔

دوسرے کتبہ میں یہ تین اشعار ہیں:

بنام آں کہ دانا ہست اکبر — کہ خالق جملہ عالم لامکانی
درود مصطفیٰ بعد از ستایش — کہ سرور انبیائے دو جہانی
فسانہ در جہاں بابر قلندر — کہ شد در دور گیتی کامرانی

ان اشعار میں اللہ تعالیٰ کو دانا، اکبر جملہ عالم کا خالق اور لامکان کہا گیا ہے، پھر اس حمد کے بعد محمد مصطفےٰ ﷺ پر درود بھیجا گیا ہے اور آپ کو دونوں جہان کا سردار کہا گیا ہے، پھر آخری شعر میں کہا گیا ہے کہ بابر قلندر کا افسانہ دنیا میں پھیلا ہوا ہے، اس لئے کہ وہ اس دنیا میں کامران رہے۔

اوپر کے چھ اشعار مسز میورج کی بابر نامہ ضمیمہ میں درج ہیں، مگر رسالہ دار العلوم کے ایڈیٹر جناب حبیب الرحمٰن قاسمی نے اس مسجد کے پورے کتبات بڑی محنت سے حاصل کئے ہیں، ان کے بیان کے مطابق ایک کتبہ پتھر کی دو میٹر لمبی اور ۵۵ سینٹی میٹر چوڑی تختی پر ہے، جو مسجد کے مسقف حصہ کے درمیانی مرکزی در کے اوپر نصب ہے، اس پر بسم اللہ کے علاوہ تین سطروں میں آٹھ اشعار لکھے ہوئے ہیں، جن میں پانچویں شعر کے دوسرے مصرع میں بانی کا نام نسبت کی صراحت کے ساتھ نظم کیا گیا ہے اور آٹھویں شعر کا دوسرا مصرع تعمیر کی تاریخ پر مشتمل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بنام آنکہ دانا است اکبر — کہ خالق جملہ عالم لامکانے — درود مصطفےٰ بعد از ستایش
کہ سرور انبیاء زبدہ جہانے — فسانہ در جہاں بابر قلندر — کہ شد در دور گیتی کامرانے
چناں کہ مطلع کشور گرفتہ — زمین راچوں مبارز آسمانے — دراں حضرت یکے سید معظم
کہ نامش میر باقی اصفہانے — مشیر سلطنت تدبیر ملکش — کہ ایں مسجد حصار مہتانے
خدایا در جہاں تابندہ ماند — کہ خیر و بخت و تخت و زندہ گانے — دریں عہد و دریں تاریخ میموں

کہ نہ صدیج وی بودہ نشانے (ان دوسطروں میں عربی میں کچھ لکھا ہوا ہے جو پڑھا نہیں جاسکا۔)

مسجد کے اندرونی حصے میں منبر کے پاس دائیں طرف یہ کتبہ ہے:

بمنشائے بابر خدیو جہاں — بسا بلکہ باکاخ گردوں عنان
بناکرد ایں خانۂ پائیدار — امیر سعادت نشاں میر خان
بماند ہمیشہ چنیں بانیش — چناں شہر یار زمین و زمان

بائیں جانب یہ کتبہ ہے:

بفرمودہ شاہ بابر کہ عدلش — بنائیست باکاخِ گردوں ملاقی
بناکردہ ایں مہبط قدسیاں را — امیر سعادت نشاں میر باقی
بود خیر باقی و سال بنائش — عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی

۹۳۵ھ

جناب حبیب الرحمٰن صاحب کا بیان ہے کہ ۲۷ / مارچ ۱۹۳۴ء میں اجودھیا میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تو اس موقع پر فسادی آخری دونوں کتبوں کو اکھاڑ لے گئے، بعد میں منبر کے بائیں جانب والے کتبے کی ایک نقل تیار کر کے تہور خان ٹھیکیدار نے نصب کرا دیا، البتہ دائیں جانب کی نقل وہ نہ کرا سکے، مگر ان تینوں کتبوں کی فلم اور اس کا فوٹو ضمیمۂ فارسی و عربی ہندوستانی کتبات ۱۹۶۵ء ناگپور میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ان کتبوں کے معانی ہم یہاں مسلسل طریقہ سے پھر لکھ دیتے ہیں۔

اس نام پر جو کہ دانا اور سب سے بڑا ہے اور جملہ لامکانے کا خالق ہے، اس کی تعریف کے بعد مصطفٰے (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود ہو، جو نبیوں کے سردار اور دنیا کے خلاصہ ہیں، بابر قلندر کا فسانہ دنیا میں ہے، اس لئے کہ وہ دنیا کے دور میں کامیاب رہے، جب کہ انہوں نے ملک کے مطلع کو حاصل کیا تو زمین آسمان سے لڑنے لگی، اسی شہر میں ایک عظمت والے سید ہیں، ان کا نام میر باقی اصفہانی ہے، وہ سلطنت کے مشیر ہیں اور ان کی تدبیر سے یہ مسجد چاند

کی جگہ اچھے لوگوں کا حصار بن گئی۔

اے خدا اس دنیا میں نیکی، بخت، تخت اور زندگی چمکتی رہے، اسی عہد میں اور اسی مبارک تاریخ یعنی ۹۳۵ھ میں یہ بنی۔

دنیا کے مالک، بابر کی منشا سے جس کی عنان کاخ گردوں ہے، اس خانہ پائیدار کی بنیاد امیر سعادت نشان میر خان نے ڈالی، ایسے بانی ہمیشہ باقی رہیں اور ایسے زمین و زمان کے شہریار بھی۔

بابر کے فرمانے پر جس کی عدل پروری آسمان کے محل سے ملتی ہے، اس کی بنیاد سعادت حاصل کرنے والے ایک امیر میر باقی نے فرشتوں کے اترنے کی جگہ کی بنیاد ڈالی، یہ نیکی باقی رہے، اس لئے اس کی بنیاد کے سال کی تاریخ اس سے ظاہر ہوئی جب میں نے کہا ''بود خیر باقی''۔

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ اس مسجد کو بابر کے ایک امیر میر باقی نے بنوایا، ''بفرمودہ شاہ بابر'' اور ''بمنشائے بابر'' سے یہ ظاہر ہے کہ بابر کے کہنے یا اس کی خواہش پر یہ بنوائی گئی، یا بابر کے زمانہ میں بنی، اس لئے یہ الفاظ تعظیماً یا رسماً لکھ دیے گئے ہیں۔

غاصبانہ قبضہ کی زمین پر مسجد کی تعمیر ناجائز: ان کتبات کی سند کو کسی لحاظ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد رام چندر جنم بھومی کو مسمار کر کے بنائی گئی، اگر یہ اس طرح بنائی گئی ہوتی تو اس زمانہ میں بابر یا اس کے حاکم اپنے فاتحانہ غرور اور پندار میں یہ ضرور لکھ دیتے کہ شرک و کفر کی ایک جگہ کو منہدم کر کے یہ مسجد تعمیر کی گئی اور اس وقت یہ لکھنے سے کون ان کو روک سکتا تھا، بابر کی طرف فقہ بابری منسوب ہے اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کسی غاصبانہ قبضہ کی زمین پر مسجد نہیں بنائی جا سکتی ہے اور اگر ایسی کوئی مسجد بنی تو علما اور مفتیان وقت اس میں نماز پڑھنے کا کبھی فتویٰ نہیں دے سکتے اور اسلام کی گذشتہ تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں، اگر کسی عبادت گاہ کے کسی حصہ کو بھی زبردستی حاصل کر کے مسجد میں

شامل کیا گیا تو بعد میں وہ توڑ دیا گیا، بنوامیہ کے زمانہ میں ولید بن عبدالملک نے دمشق میں ایک شاندار مسجد بنانے کا ارادہ ظاہر کیا، اس کے لئے زمین کی کمی پڑی، اس نے پڑوس کے ایک گرجے کی زمین عیسائیوں سے مانگی، انہوں نے یہ کہہ کر زمین دینے سے انکار کیا کہ خوشی سے تو نہیں دے سکتے، زبردستی سے اگر لی گئی تو لینے والے کو کوڑھ ہو جائے گا، ولید کو غصہ آ گیا اور یہ کہہ کر زمین لے لی کہ دیکھیں، کیسے کوڑھ ہوتا ہے، حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کا زمانہ آیا تو عیسائیوں نے ان سے شکایت کی، حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز خلفائے راشدینؓ کے اسوۂ حسنہ پر چلتے تھے، انہوں نے حکم دیا کہ مسجد کا وہ حصہ جو گرجے کی زمین پر تعمیر ہوا ہے، وہ فوراً ہدم کرادیا جائے اور سرکاری خرچ سے گرجے کی تعمیر از سر نو ہو۔ (خطبات شبلی ص ۷۵۔۷۴)

غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی رواداری: ہمارے رسول اکرم ﷺ کے زمانہ میں جب کوئی ملک یا علاقہ فتح ہوا اور وہاں کے لوگوں نے آپ کی حکومت تسلیم کر لی تو ان کو آپ برابر یہ حقوق دیتے رہے کہ ان کی جانیں، ان کا مذہب، ان کی زمینیں، ان کے اموال، ان کے حاضر و غائب، ان کے قافلے، ان کے سفر، ان کی مورتیں اللہ کی امانت اور اس کے رسول کی ضمانت میں ہیں، ان کی موجودہ حالت میں کوئی تغیر نہ کیا جائے اور نہ ان کے کسی حق میں دست اندازی کی جائے اور نہ ان کی مورتیں بگاڑی جائیں، کوئی اسقف اپنی اسقفیت، کوئی راہب اپنی رہبانیت، کلیسا کا کوئی منتظم اپنے عہدہ سے نہ ہٹایا جائے، جو بھی کم یا زیادہ ان کے پاس ہے، اسی طرح رہے گا، اس کے زمانۂ جاہلیت کے کسی جرم یا خون کا بدلہ نہیں لیا جائے گا، ان سے فوجی خدمت نہیں لی جائے گی اور نہ ان پر عشر لگایا جائے گا اور نہ اسلامی فوجیں ان کی پامالی کریں گا، ان میں سے جو شخص اپنے کسی حق کا مطالبہ کرے گا اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گی، (فتوح البلدان بلاذری، ص ۷۶، مطبوعہ مصر اور دین رحمت مطبوعہ دارالمصنفین ص ۳۳۸۔۳۳۷)

اسی پر صحابۂ کرام کا عمل رہا اور اگر تعصب کی عینک اتار کر ہندوستان کے

مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہی روایت سندھ میں محمد بن قاسم کی آمد سے بہادر شاہ ظفر تک قائم رہی اور اگر مسلمان حکمرانوں کا یہ مذہبی فریضہ ہوتا کہ وہ مندروں کو مسمار کریں، بتوں اور مورتوں کو توڑ کر ہندوستان کی سرزمین کو ان چیزوں سے پاک کردیں، تو شاید یہاں اتنے لاکھوں اور کروروں مندر دکھائے نہ دیتے، جو قدیم زمانے سے اب تک موجود ہیں، اگر اسلام کی مذکورہ بالا تعلیمات کی کہیں اور کسی زمانہ میں کسی سے خلاف ورزی ہوئی تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس سے جرم کا ارتکاب ہوا۔

بابر کی رواداری: بابر کے متعلق یہ بھی گمان نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے یہاں آتے ہی مندروں اور مورتیوں کو مسمار کرنا شروع کردیا، کیوں کہ جس سال یہ مسجد بنی ہے اسی سال اس نے ہمایوں کے لئے یہ وصیت نامہ لکھ کر چھوڑ رکھا تھا:

''اے فرزند! ہندوستان کی سلطنت مختلف مذاہب سے بھری ہوئی ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے اس کی بادشاہت عطا کی، تم پر لازم ہے کہ اپنے لوح دل سے تمام مذہبی تعصبات کو مٹادو اور ہر مذہب کے طریقہ کے مطابق انصاف کرو، تم خاص کر گائے کی قربانی کو چھوڑ دو، اس سے تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کرسکو گے، پھر اس ملک کی رعایا شاہی احسانات سے دبی رہے گی، جو قوم حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے، اس کے مندروں اور عبادت گاہوں کو منہدم نہ کرو، عدل وانصاف اس طرح کرو کہ بادشاہ رعایا اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے، اسلام کی ترویج ظلم کی تلوار سے زیادہ احسانات کی تلوار سے ہو سکتی ہے، شیعوں اور سنیوں کے اختلاف کو نظر انداز کرتے رہو، ورنہ اسلام میں ان سے کمزوری پیدا ہوتی رہے گی، مختلف عقائد رکھنے والی رعایا کو اس طرح ان عناصر اربعہ کے مطابق ملاؤ، جس طرح انسانی جسم ملا رہتا ہے، تاکہ سلطنت کا ڈھانچہ اختلافات سے پاک رہے) یکم جمادی الاولیٰ ۹۳۵ھ انڈیا ڈیوائڈڈ ص ۳۹ تیسرا اڈیشن)

یہ تحریر اسی سال کی ہے جس سال بابری مسجد بنائی گئی، اگر یہ رام جنم بھومی مندر کو

منہدم کر کے بنائی جاتی تو وہ اپنے لڑکے ہمایوں کو یہ وصیت نامہ کیوں کر لکھ سکتا۔

اس وصیت نامہ کو ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ نے اپنی مشہور کتاب انڈیا ڈیوائڈڈ میں درج کر کے بابر کو مذہبی تعصب سے بالاتر تسلیم کیا ہے۔

ہندو مورخین کی شہادت: اسی طرح پروفیسر سری رام شرما کی کتاب مغل امپائر آف انڈیا کی جلد اول کے صفحہ ۵۴۔۵۵ پر بھی بابر کا یہ وصیت نامہ درج ہے، اسی لئے پروفیسر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہم کو کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی ہے کہ بابر نے کسی مندر کو منہدم کیا اور کسی ہندو کی ایذا رسانی کی محض اس لئے کہ وہ ہندو ہے، (ص ۵۵۔۱۹۴۵ء ایڈیشن)

جناب رام پرشاد کھوسلہ پٹنہ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے، انہوں نے ۱۹۳۴ء میں مغل کنگ شپ اینڈ نوبیلٹی لکھی، اس میں بابر کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بابر کی تزک میں ہندوؤں کے کسی مندر کے انہدام کا ذکر نہیں اور نہ یہ ثبوت ہے کہ اس نے کفار کا قتل عام ان کے مذہب کی وجہ سے کیا، وہ نمایاں طور پر مذہبی تعصب اور تنگ نظری سے بری تھا۔ (ص ۲۰۷)

بابر اور مندروں کا احترام: بابر کی تزک بابری کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ تو ہندوؤں کے مندروں کا ذکر لطف لے لے کر کرتا ہے، مثلاً جب وہ گوالیار کے قلعہ میں پہونچا تو وہاں کے عالی شان بت خانہ کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ یہاں کے تالاب کے مغرب میں ایک عالی شان بت خانہ ہے، سلطان شمس الدین التتمش نے اس بت خانہ کے پہلو میں ایک مسجد بنائی ہے، یہ بت خانہ اتنا بلند ہے کہ قلعہ میں اس سے اونچی کوئی عمارت نہیں، دھول پور کے پہاڑ پر سے گوالیار کا قلعہ اور بت خانہ خوب نظر آتا ہے، کہتے ہیں کہ اس بت خانہ کا سارا پتھر وہاں کے تالاب کو کھود کر حاصل کیا گیا ہے، (اردو ترجمہ ص ۳۳۲، انگریزی ترجمہ بابر نامہ ص ۶۱۰)

اگر بابر چاہتا تو گوالیار کے اس عالیشان بت خانہ کی تعریف کرنے کے بجائے

اس کو منہدم کردیتا، اس کے لئے اس ملک کے مندر اور بت خانے بالکل نئی چیزیں تھیں، اس لئے ان کو شوق سے دیکھتا رہا۔

گوالیار کے بت خانہ کے پہلو میں سلطان شمس الدین التمش کی بنائی ہوئی ایک مسجد سے یہ ظاہر ہے کہ التمش نے بھی اس کے بغل میں بت خانہ کو منہدم کرنا پسند نہیں کیا۔

بابر پھر اوردا کی طرف جاتا ہے تو لکھتا ہے کہ اس کے اطراف کے پہاڑ کا ایک ٹکڑا تراش کر چھوٹے بڑے بتوں کی مورتیں بنائی گئی ہیں، اس کے جنوب میں ایک بڑے بت کی مورت ہے، جو تقریباً بیس گز کی ہوگی، ان سب بتوں کو ننگا بنایا ہے، ان کے ستر کو ڈھکا نہیں ہے، (اردو ترجمہ ص ۳۳۳، بابر نامہ ص ۶۱۲-۶۱۱)

بابر چاہتا تو ان برہنہ بتوں کو مسمار کر دیتا، مگر ان کو اسی طرح رہنے دیا، پھر گوالیار کے بت خانہ کی سیر کرنے کو گیا، تو لکھتا ہے کہ بت خانہ میں بعض جائے دہرے اور بعض جائے تہرے دالان ہیں، مگر اگلی وضع کے نیچے نیچے، ان کے دروازہ کے پتھر میں مجسم بت کندہ کئے ہوئے بت خانے کے بعض ضلعے مدرسوں کی وضع کے ہیں، صدر مقام میں ایک بڑا اونچا برج ہے، جس کے حجرے ایسے ہیں جیسے مدرسوں کے حجرے ہوتے ہیں، ہر حجرے کے اوپر پتھر کی تراشی ہوئی چھوٹی چھوٹی برجیاں ہیں، حجروں میں نیچے کی جانب کے پتھروں میں بت تراشے ہیں، ان مقاموں کی سیر کر کے گوالیار کے غربی دروازہ سے نکل کر قلعہ گوالیار کے جنوب میں ہوتا ہوا رحیم داد کے چار باغ میں جو ہتھیا پول دروازے کے سامنے ہے، آکر ٹھہرا۔ (اردو ترجمہ ص ۳۳۴، انگریزی ترجمہ بابر نامہ ص ۶۱۴-۶۱۳)

بابر نے ان مندروں اور بت خانوں کو توڑنے کے بجائے وہاں سیر کر کے ان سے لطف لیا اور اپنی تزک میں ان کی تفصیل قلم بند کر کے ان کو تاریخی اہمیت دے دی ہے البتہ اس کا اعلیٰ اور بلند جمالیاتی ذوق اس کو پسند نہیں کرتا تھا کہ چمن بندی کے حسن کو بھدّی مورتیوں سے ضائع کیا جائے، اوردا کا ایک چمن اس کو بہت پسند آیا اور اس سے بڑی دلچسپی لی

لیکن اس کے خیال میں اس کا بڑا عیب یہ تھا کہ اس میں طرح طرح کی مورتیاں بنائی گئی تھیں، چمن کی خوبصورتی کی خاطر ان کو وہاں سے برطرف کرادیا۔(اردو ترجمہ ص ۳۳۳ بابر نامہ ص ۶۱۲)

بابر کی شخصیت پر ہندوؤں کا تبصرہ: اب تک تمام ہندو مورخین بابر کی شخصیت کی دلآویزی کے قائل رہے ہیں، مغلوں کے آخری دور کے مؤرخ سجان رائے نے اپنی خلاصۃ التواریخ میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''درداد و عدل مبالغہ فرمودے''۔

اگر وہ داد و عدل کا قائل تھا، تو پھر وہ کسی مندر کو بلاوجہ کیوں مسمار کرتا۔

پنڈت جواہر لال نہرو بھی بابر کی دلکش شخصیت سے متاثر تھے، وہ اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں لکھتے ہیں کہ:

''وہ نشأۃ ثانیہ کے دور میں نمونہ کا رہنما تھا، مہم جو تھا، آرٹ لٹریچر اور اچھی زندگی کا شایق تھا''۔

اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو نشأۃ ثانیہ کا نمونہ ہوگا وہ دوسروں کی عبادت گاہوں کو مسمار کر کے ظلم اور دل آزاری کا الزام لینا پسند نہیں کرسکے گا۔

الہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی اپنے زمانہ کے مشہور مؤرخ گزرے ہیں، انہوں نے اپنی تصنیف ''رائز اینڈ فال آف مغل امپائر'' میں لکھا ہے:

''بابر میں مذہبی جنون نہ تھا، اس کا رویہ ہندو، افغانی، امراء اور رعایا کے ساتھ مہذبانہ، شریفانہ اور دوستانہ تھا''۔

پھر وہ ایک لمبے تبصرہ میں رقم طراز ہیں کہ مغل سلطنت کی شان و شوکت صرف اس کی فوجی قوت میں نہ تھی بلکہ اس کی شان غیر مسلم رعایا خصوصاً راجپوتوں کے ساتھ اس کی مذہبی رواداری میں تھی، پھر اس زمانہ میں کلچر کو جو فروغ ہوا، وہ بھی ایک شاندار کارنامہ ہے،

اکبر کو اس کے مرتبہ سے محروم نہیں کیا جا سکتا لیکن اس پالیسی کا بیج اس کے ممتاز دادا بابر ہی کے زمانہ میں ڈال دیا گیا تھا اور ایک ایسی سلطنت قائم ہوئی جس کی سیاست میں مذہبی اور طبقاتی اختلاف کا کوئی دخل نہیں رہا، تخت و تاج کی حیثیت ریاست میں خاطر خواہ طریقہ پر رکھی گئی، راجپوتوں کے مسائل دوستی اور شادی بیاہ کے رشتے سے حل کیے گئے، دربار کے تہذیبی پہلوؤں کو زیادہ اہم قرار دیا گیا لیکن ان تمام باتوں کی ابتدا بابر کے زمانہ سے ہو گئی تھی، جس نے ایک نئی سلطنت قائم کرنے کا راستہ ہموار ہی نہیں کیا بلکہ کس طرح حکومت کی جانی چاہیے اس کی پالیسی بنانے کا اشارہ بھی کر دیا، اس نے ہندوستان میں ایک ایسا خاندان اور ایک ایسی روایت قائم کی جس کی مثال دوسرے ملکوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ (ص ۶۱)

ہندوستان کے ایسے بڑے محسن اور ایسی دلکش شخصیت کو بابری مسجد کے جھگڑے میں الجھانا ملک کی شاندار روایت کو مجروح کرنا ہے اور اس کی طرف من گھڑت واقعات منسوب کر کے نہ صرف ہندوستان کے علم اور دانشوری کو بدنام کرنا ہے، بلکہ ملک کی سیکولرزم، قومی یکجہتی اور وطن دوستی کے ساتھ دشمنی کا ثبوت دینا ہے لیکن اس کا بھی جائزہ لینا ہے کہ بابری مسجد کا تنازعہ کیسے کھڑا ہوا، یہ کہنے میں تامل نہیں کہ یہ برطانوی حکومت کی سامراجیت کا شاخسانہ ہے، انگریز مورخین اب بھی کچھ نہ کچھ ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے سے تکدر، ملال، غم و غصہ پیدا کرتی ہیں۔

آئین اکبری میں اجودھیا کا ذکر: اس قضیہ کا اجودھیا سے تعلق ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ مغلوں کی تاریخ میں اجودھیا کا ذکر کیسے آیا ہے، ابوالفضل نے اپنی آئین اکبری جلد اول حصہ دوم میں اجودھیا کا نام نہیں لیا ہے لیکن اودھ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اودھ ہندوستان کے بڑے شہروں میں ہے، اس کا طول البلد ۱۱۸ درجہ ۶ دقیقہ ہے اور عرض البلد ۲۷ درجہ ۲۲ دقیقہ ہے، قدیم زمانہ میں اس کی آبادی ۱۴۸ کوس طول میں اور ۳۶ کوس عرض میں پھیلی ہوئی تھی، اودھ ہندوستان کی بہت بڑی تیرتھ ہے، سواد شہر میں زمین کھودنے سے سونا

نکلتا ہے، یہ شہر راجہ رام چندر کا مسکن تھا، رام چندر تریتا دور کے ظاہری و باطنی ہر دو عالم کے پیشوا مانے جاتے ہیں، شہر کے ایک کوس کے فاصلہ پر دریائے گھاگھرا، دریائے سرجو سے مل گیا ہے اور قلعہ کے پاس سے گذرتا ہے، شہر کے قریب دو قبریں ہیں، جو سات اور چھ گز لانبی ہیں، عام طور پر مشہور ہے کہ یہ حضرت شیثؑ اور حضرت ایوبؑ پیغمبر کے مزارات ہیں، ان قبروں کی بابت عجیب وغریب افسانے ہیں، بعض اشخاص کا بیان ہے کہ رتن پور میں کبیر داس کی قبر ہے، جو سکندر لودھی کے زمانہ میں تھا کبیر کی بابت مشہور ہے کہ اس پر روحانیت کا غلبہ ہوا اور یہ مذہبوں کی ظاہر پابندیوں سے آزاد ہو کر فقیرانہ زندگی بسر کرنے لگا، کبیر داس کے اشعار ہندی زبان میں ہیں، جن سے اس کی حق شناسی اور فقر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

(آئین اکبری جلد دوم ص ۷۸ رتن پور میں کبیر کی قبر نہیں ہے)

اجودھیا میں مسلمانوں کی آبادی: اس اقتباس میں کہیں اس کا ذکر نہیں آیا ہے کہ بابر نے رام چندر جی کی جنم بھومی کے مندر کو توڑ کر ایک مسجد بنائی اور یہ تو بالکل یقینی ہے کہ بابر کے زمانہ سے پہلے اجودھیا میں مسلمانوں کی آبادی ہو چکی تھی۔

اوپر آئین اکبری کے اقتباس سے ظاہر ہوا ہوگا کہ یہ یہاں عام روایت کے مطابق حضرت شیثؑ اور حضرت ایوبؑ کی قبریں بھی ہیں، ان کی اصلیت سے صرف نظر کرنے کے باوجود مسلمانوں کو اس جگہ سے جذباتی لگاؤ رہا، حضرت شیثؑ کی قبر کے احاطہ میں بہت سے بزرگانِ دین مدفون ہیں، یہاں سالار مسعود غازیؒ کے مجاہدین کی قبریں بھی ہیں، یہاں بخشی باباؒ، حضرت لعل شاہ باز قلندرؒ، حضرت سید علاء الدین خراسانیؒ، حضرت جمال الدین قاضی قدوہؒ حضرت سلطان موسیٰ عاشقانؒ اور پیر کشاویؒ کے جو مزارات ہیں، ان کے حالات پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بزگان دین بابر سے پہلے اجودھیا آکر سکونت پذیر ہو چکے تھے اور ان سے لوگ فیوض و برکات حاصل کرتے رہے۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کا آبائی مکان اجودھیا ہی میں تھا اور ان کی

جائے پیدائش اجودھیا ہی میں بتائی جاتی ہے، اسی لئے ان کے نام کے ساتھ اودھی لکھا جا ہے، وہ نسباً سادات حسینی میں سے تھے، اس کے یہ معنی ہیں کہ اجودھیا میں اس وقت سادات بس چکے تھی ان مسلمانوں کے لیے ایک، بلکہ ایک سے زیادہ مسجدیں بنائی گئیں تو کون سے تعجب کی بات ہے۔

قضیۂ نامرضیہ کا آغاز: مغل بادشاہوں کی حکومت کے زمانہ میں رام جنم بھومی اور بابری مسجد کے تنازعہ کا ذکر کہیں نہیں ملتا، ان کی حکومت کمزور ہوئی تو اودھ میں نوابوں کی حکومت قائم ہوگئی، یہ بھی بے جان ہوتی چلی گئی تو انگریزوں نے اس پر تسلط جمانا شروع کیا، وارن ہسٹنگز (۸۵-۱۷۷۲) کے زمانہ ہی سے اودھ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ایک امدادی فوج متعین کر دی گئی تھی، اس کے مصارف نواب کے ذمہ تھے، اس فوج میں وارن ہسٹنگز نے غیر معمولی اضافہ کر دیا، اس کے مصارف بھی نواب کو برداشت کرنا پڑا، فوجی مصارف کے لئے جب زر کثیر کی رقم مانگی جانے لگی تو نواب سے باقاعدہ ادا نہ ہو سکی، وارن ہسٹنگز نے بیگمات اودھ کے زیورات اور جواہرات چھین کر یہ رقمیں وصول کیں، اس سے ظاہر ہے کہ اودھ کے نواب انگریزوں کے زیر نگیں ہو گئے تھے، لارڈ ویلزلی کے زمانہ میں یہ فوج دس ہزار سے بھی زیادہ بڑھا دی گئی، اس کے مصارف کے لئے نواب کو اپنا آدھا علاقہ کمپنی کے حوالہ کرنا پڑا، لارڈ لارنس کے زمانہ سے وہاں ایک انگریز ریزی ڈنٹ رہنے لگا، جو اپنی فوج کی مدد سے ریاست کے نظم ونسق کا نگراں ہو گیا، لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ میں نواب واجد علی شاہ نام کے نواب رہ گئے، یہ ساری تفصیلات اس زمانہ کی کسی تاریخ میں پڑھی جاسکتی ہیں، خود نواب واجد علی شاہ نے اپنی مثنوی حزن اختر میں لکھا ہے:

یہ واجد علی ابن امجد علی ۔۔۔ سناتا ہے اب داستاں رنج کی
کہ جب دس برس سلطنت کو ہوئے ۔۔۔ جو طالع تھے بیدار سونے لگے
ہوا حکم جنرل گورنر یہ بار ۔۔۔ کرو سلطنت کو خلا ایک بار

111789

خفاکش کا شاہ اودھ نام ہے — حکومت کا اختر یہ انجام ہے
جو وہ لارڈ ڈلہوزی اس وقت تھے — مضامین انہوں نے یہ خط میں لکھے
رعایا بہت تم سے ناراض ہے — تمہاری ریاست ہے بدنام شے
رزیڈنٹ جرنیل اوٹرم جو تھے — گورنر کا خط مجھ کو وہ دے گئے
وہ لائے تھے اس طرح کی ساتھ فوج — کہ جس طرح دریا کی آتی ہے موج

سید کمال الدین حیدر حسنی الحسینی المشہدی نے اپنی تصنیف قیصر التواریخ یا تواریخ اودھ کی جلد دوم میں لارڈ ڈلہوزی ریزیڈنٹ جنرل سلیمن اور جنرل اوٹرم، نواب واجد علی شاہ کے ساتھ جو کچھ کرتے رہے اس کی پوری تفصیل لکھی ہے، اسی زمانہ میں اجودھیا کے مسجد و مندر کا جھگڑا کھڑا ہوا، جو ۱۸۵۵ء میں انتہائی خوں ریز تصادم تک پہنچ گیا، اس میں سراسر انگریزوں کا ہاتھ رہا، انہوں نے شروع ہی سے یہ سوچ رکھا تھا کہ اس ملک میں ان کی حکومت اسی وقت تک قائم رہ سکے گی جب تک یہاں کے مختلف فرقوں میں باہمی نفرت پیدا ہوتی رہے گی، اودھ میں ان کا تسلط ہوا تو اجودھیا ان کی سامراجی حکمت عملی کا بڑا اچھا دارالعمل بن گیا، اس شہر کو ہندو اپنے لئے ایک پوتر استھان سمجھتے تھے، مسلمانوں کی باضابطہ حکومت دہلی میں ۱۲۰۵ء ہی سے شروع ہوگئی تھی، اس کے بعد وہ جس شہر میں آباد ہوتے وہاں مسجدیں ضرور تعمیر کراتے، ان کے لئے خطیب اور مؤذن مقرر کرتے، سرائیں بھی بنواتے، درویشوں کے لئے خانقاہوں کی تعمیر بھی کرادیتے، مدرسے بھی قائم کرتے جن کے لئے مدرسین مقرر کرتے، مسلمان اجودھیا میں سکونت پذیر ہوئے تو یہاں بھی مسجدوں کی تعمیر ہوئی، انگریزوں کا تسلط اودھ پر ہوا تو ان کو اجودھیا میں مسجد اور مندر کا تنازعہ کھڑا کرنے کا موقع ملا، وہ مسلمانوں سے حکومت چھین رہے تھے، اس لئے ان کو ہندوؤں کی ہمدردی حاصل کرنے کی ضرورت تھی، انہوں نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف اپنی مختلف تحریروں میں یہ لکھ کر ورغلایا کہ اجودھیا کی زیادہ تر مسجدیں ان کے مندروں کو توڑ کر یا ان کی کسی پوتر

جگہ پر بنائی گئی ہیں، جیسا کہ اسی کتابچہ میں الگزنڈر کننگھم کی تحریروں سے ظاہر ہوگا، گو
انگریز اپنے گزیٹیر اور آثار قدیمہ کی رپورٹ میں اس پوتر مقام کی تحقیر یہ لکھ کر بھی کر
رہے کہ یہ تو ویران ہو کر جنگلوں میں گم ہو چکا تھا، اس کو از سر نو آباد کیا گیا، جس میں پو
مقامات کی تعین محض قیاس سے کی گئی ہے، ایسی تحریر لکھنے کا مقصد یہ بھی ہوتا کہ وہ مسلمانوں کو
اس کی ترغیب دیں کہ وہ اس بات کو تسلیم نہ کریں کہ ان کی مسجدیں پوتر مقامات پر بنائی گئی
مسلمانوں کے مقابلہ میں انگریزوں کا مصلحت آمیز ہمدردانہ رجحان ہندوؤں کی طرف زیاد
تھا، انہوں نے اس کی ترویج پرزور طریقہ پر کی کہ مسلمانوں کا یہ مذہبی عقیدہ کہ وہ جہاں
جائیں وہاں کی قوم پر اپنا مذہب زبردستی نافذ کریں اور وہاں کی عبادت گاہوں کو منہدم
کر کے اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر کریں جیسا کہ آگے ذکر آئے گا کوئی کسی غیر ذمہ دار یا برخو
غلط یا اسلامی تعلیمات سے ناواقف مسلمان مصنف کی تحریروں، یا غیر معتبر کتابوں سے ایسا
ثابت بھی کرے تو پھر یہ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر یہ واقعی مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ رہتا تو
ہندوستان میں ان کے حکمرانوں کی فوجیں کشمیر سے راس کماری اور مغرب سے مشرق تک
فتح و تسخیر میں مشغول رہیں، ان علاقوں میں ایک مندر بھی نظر نہ آتا، صرف مسجد ہی مسجدیں
ہوتیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکومت میں غیر مسلموں کو جو رعایتیں دی ہیں ان
کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں، اگر تکرار ہمارے ناظرین کو گراں خاطر نہ ہو تو پورے وثوق
کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ قرآن مجید کو تو نہیں مانتے لیکن ان کتابوں میں سے کسی
ایک کو تسلیم کرتے ہیں، جن کا ذکر کلام پاک میں ہے، تو ان کے متعلق اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ
اگر وہ اسلامی حکومتوں کے وفادار شہری ہیں تو ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رکھی
جائیں، ان کو اپنے مذہب کے بدلنے پر مجبور نہ کیا جائے، ان کی جان، عزت اور مال کی
حفاظت کی جائے، ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں، ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا
جانور اور ان کے جائز کھانے کھا سکتے ہیں، کچھ لوگ ایسے ہیں جو آسمانی کتابوں میں سے کسی

کو تسلیم نہیں کرتے، مگر وہ خود اپنے لئے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کی مدعی ہیں، ان میں صابی، مجوسی، ہندو اور بودھ وغیرہ شامل ہیں، اسلام کی تعلیم کے مطابق مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے ہیں، ان کا ذبیحہ بھی نہیں کھا سکتے، ان دو باتوں کے علاوہ اگر وہ حکومتوں کے وفادار ہیں تو ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اہل کتاب کو دیے گئے ہیں، یعنی ان کی جان، عزت و آبرو، مال اور ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت اسلامی حکومت کا فرض ہے، ہمارے رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں رحمۃ للعلمین بنا کر بھیجے گئے اور آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا کہ آپ ﷺ کا کام صرف اللہ کا پیام پہنچا دینا ہے، اگر لوگ اس سے روگردانی کریں تو اس کی ذمہ داری ان پر ہے، آپ ﷺ پر نہیں، اس کے جواب دہ وہ ہیں، آپ نہیں، ان سے حساب لینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، آپ ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے، (سورہ مائدہ: ۹۵، غاشیہ ۲۶)

ان اعلیٰ تعلیمات کے بعد بھی انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی مہم جاری کر رکھی تھی، کہ وہ تو دوسروں پر اپنا مذہب مسلط کرتے ہیں اور دوسروں کی عبادت گاہیں مسمار کر کے اپنی مسجدیں تعمیر کرتے ہیں، مسلمان اپنی مسجدیں بنانے میں تو بہت زیادہ محتاط اور پرہیزگار رہے، پہلے ذکر آیا ہے کہ کسی غاصبانہ قبضہ والی زمین پر تو مسجد بنانا بالکل ہی جائز نہیں اور اگر بنالی جائے تو وہ توڑ دی جائے، مسجد بنانے میں علماء و فقہا نے بڑے شرائط مقرر کئے ہیں، فقہاء کی یہ رائے تسلیم کر لی گئی ہے کہ جو مسجد ریاکاری یا نام و نمود یا کسی اور غرض فاسد کے لئے بنائی جائے جس میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا خیال نہ ہو یا جو مسجد ناپاک مال سے بنائی جائے تو وہ مسجد ضرار کی سی ہے، (تفسیرات احمدی، ص ۲۸۳، مدارک علی الخازن ج ۲ ص ۲۶۵) یعنی وہ مسلمانوں کی نہیں، منافقوں کی مسجد ہے۔

فقہاء کی یہ بھی رائے ہے کہ اگر کوئی شخص ایسی جگہ مسجد بنائے جس میں دوسرے کا حق ہو اور اس کی رضامندی حاصل نہیں کی گئی ہو تو اس حق والے کو اختیار ہے کہ ایسی مسجد کو

باطل قرار دے اور اپنا حق لے لے، اس کو اس طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک زمین پر کس کو جوار یا رشتہ کی وجہ سے حق شفعہ حاصل ہے تو اس پر مسجد نہیں بنائی جاسکتی ہے، (فتح القدیر ج ۲، ص ۸۷۵) اسی طرح ایک شخص بیمار ہے یا اس کی خواہش ہے کہ وہ اپنا گھر بار مسجد میں تبدیل کردے، یا اس نے مرتے وقت اس کی وصیت بھی کردی، مگر اس کے جائز ورثاء وصیت کو تسلیم نہ کریں تو اس کی وصیت جائز نہیں سمجھی جائے گی (فتاویٰ عالم گیری ج ۲ ص ۴۵۶) اسی طرح بیع فاسد سے خریدی ہوئی زمین پر مسجد بنانے کی اجازت نہیں (فتح القدیر ج ۲ ص ۸۷۵) ناجائز طریقہ سے حاصل کی ہوئی زمین پر بھی مسجد بنانا درست نہیں ہے، ناجائز حصول کی جو بھی شکل ہو مثلاً کسی کا گھر زبردستی کچھ لوگ حاصل کر کے وہاں مسجد یا جامع مسجد بنالیں تو ایسی مسجد میں نماز پڑھنا جائز نہ ہوگا، (فتاویٰ عالمگیری ج ۶ ص ۲۱۴) اسی طرح کوئی راستہ ایسا ہو کہ ایک مسجد کے بننے سے چلنے والوں کو نقصان یا تکلیف ہو تو بلاشبہ ایسی مسجد بنانا درست نہیں (فتاویٰ عالمگیری ج ۳ ص ۲۲۹) مسجد کی تعمیر کے لئے زمین کو حلال طریقہ سے حاصل کیا جانا اس کی صحت کی شرط ہے اور اس حلال طریقہ کی وضاحت اس طرح کی جاتی ہے کہ اس زمین پر کسی بھی شخص کا کوئی حق نہ ہو، ہدایہ میں ہے کہ اگر ایک شخص نے کوئی ایسی مسجد بنائی جس کے نیچے کوئی تہ خانہ ہو، اس کے بالائی حصہ پر کوئی مکان ہو، بیچ میں مسجد ہو اور اس کا دروازہ کسی راستہ پر کھلتا ہو اور گو اس مسجد کے حصہ کو اسی شخص نے اپنی ملکیت سے نکال کر مسجد بنادیا ہو، تو یہ درست نہیں ہوگا، کیونکہ جب اس نے اس کو باضابطہ فروخت نہیں کیا ہے تو اس کو یا اس کے انتقال کے بعد اس کے وارثوں کو اس حصہ کو فروخت کرنے کا حق باقی رہے گا، صاحب ہدایہ نے اس مسئلہ کی عقلی دلیل یہ دی ہے کہ یہ مسجد اللہ کے لئے خالص نہیں تھی، کیونکہ اس سے بندہ کا حق متعلق ہے، قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ مسجد وہ ہے جس میں کسی کو بھی حق منع حاصل نہ ہو، یعنی اس مسجد پر کسی کا کسی طرح کا کوئی بھی حق نہ ہو، (ہدایہ ج ۲، ص ۶۲۵، ۲۶۴) فقہاء کا اس مسلک پر ہمیشہ عمل رہا، موجودہ دور کے فتاویٰ میں

بھی اسی قسم کی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً فتاویٰ رضویہ میں ایک استفتاء کے جواب میں یہ لکھا گیا ہے کہ مسجدیں اللہ کے لئے ہیں، ان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی شش جہت میں جمیع حقوق عباد سے منزہ ہوں، اگر کسی حصہ میں مِلک عبد باقی ہے تو مسجد نہ ہوگی، (فتاویٰ رضویہ ج ۶، ص ۴۵۳) اسی طرح ایک استفتاء میں یہ پوچھا گیا کہ مسلمان چاہتے ہیں کہ ہندو زمین دار سے زمین خرید کر مسجد بنائیں، کیونکہ مسلمانوں کے پاس موروثی زمین سے الگ کوئی ایسی زمین نہیں ہے جس پر مسجد یا جامع مسجد بنائی جا سکے لیکن وہ ہندو زمین دار زمین نہیں بیچنا چاہتا، تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ اس کے جواب میں یہ فتویٰ دیا گیا کہ اگر وہ ہندو زمین نہیں بیچتا تو پھر مسلمان گھروں ہی میں نماز پڑھیں، (فتویٰ رضویہ ج ۶، ص ۴۶۱)، اسی طرح اگر زمین مشترک ہے تو شرکاء کی اجازت کے بغیر مسجد بنانا جائز نہیں اور اگر ایسی زمین پر مسجد بنا بھی دی جائے تو اس میں نماز پڑھنے کا ثواب نہیں ہے، بلکہ اس میں نماز ہی نہ پڑھی جائے، (مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحیٔ، بحوالہ آداب المسجد مفتی محمد شفیع ص ۲۵) اسی طرح نابالغ کی زمین پر مسجد بنانا جائز نہیں، (تتمہ، امداد الفتاویٰ بحوالہ آداب المساجد مفتی محمد شفیع ص ۲۵) فاحشہ عورت نے اگر اپنی حرام آمدنی سے مسجد بنا دی تو وہ مسجد ہی نہیں تسلیم کی جائے گی اور نہ اس کو اس کا ثواب ملے گا، (مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحی ص ۲۶۸)

جب کسی جگہ مسجد بنانے میں اتنے شرائط ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان یا ان کے فاتح اور حکمراں مندروں کو توڑ کر مسجدیں بناتے رہے ہوں، اوپر کہا گیا ہے کہ مسجد بنانے کے لئے زمین حلال طریقہ پر حاصل کرنا لازمی ہے، اس کے حاصل کرنے میں کسی بندہ کا حق زائل نہ ہوتا ہو اور زبردستی نہ کی گئی ہو، تو پھر کسی مندر کو توڑ کر وہاں پر مسجد بنانا کیوں کر درست، جائز اور صحیح قرار دیا جا سکتا ہے؟ تو یہ مان لیا جا سکتا ہے کہ مسلمان فاتحوں اور حکمرانوں نے جنگ کے زمانہ کے غیظ وغضب میں کسی مندر کو مسمار کر دیا ہو، یا کسی مندر کو سازش، بغاوت یا فحاشی کا اڈہ سمجھ کر اس کو منہدم کر دیا ہو، مگر مندر کو توڑ کر اس کی جگہ پر مسجد بنانا

ثابت نہیں کیا جاسکتا اور اگر کسی محرور المزاج اور مغلوب الغضب فاتح نے ایسی مسجد بنادی راسخ العقیدہ فقہاء اور علماء کے نزدیک یہ مسجد قرار نہیں دی جاسکتی ہے، یہ بھی قرین قیاس ہے کہ کسی خاص سبب سے توڑے ہوئے مندر کے پاس یا اس سے تھوڑے فاصلہ پر کوئی مسجد بنادی گئی ہو، مگر مندر کی جگہ ہرگز کہیں مسجد نہیں بنائی گئی، یہ اور بات ہے کہ کسی سیاسی مصلحت چرب زبانی سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ مندر توڑ کر مسجد بنائی گئی انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت کے زمانہ میں ایسی باتوں کی ضرور ترویج کی، مگر ان کو تو واقعہ کے سچ اور جھوٹ ہونے سے غرض نہ تھی، ان کے پیش نظر تو مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے دلوں میں نفرت پیدا کرنا تھا، وہ پیدا ہو کر رہی، اسی پس منظر کے ساتھ اجودھیا میں مسجد اور مندر کا جھگڑا کھڑا کردیا گیا، ایک مؤرخ یہ سوال کرسکتا ہے کہ یہ جھگڑا مغل بادشاہوں کے دور میں کیوں نہیں شروع ہوا؟ اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ ہندو اس دور میں دبے سہمے رہے، اس لئے وہ خاموش تھے، حالاں کہ اکبر سے لے کر اس کے جانشینوں کے دور عروج تک بڑے بڑے راجپوت سرداران کے لشکر اور دربار میں رہ کر اپنے کارناموں کی وجہ سے خطابات اور امتیازات پاتے رہے، انہوں نے اپنے شاہی آقاؤں کی توجہ اجودھیا جیسے پوتر مقام کے مندروں کی بے حرمتی کی طرف کبھی نہیں دلائی اور شاید وہ اس کو ایک پوتر مقام سمجھ کر یہاں کی تیرتھ کے لئے کبھی آئے بھی نہیں، اس جگہ کی اہمیت برطانوی حکومت کے زمانے میں زیادہ ہوئی، پھر مسمار شدہ مندروں کا مسئلہ اٹھا کر ہندوؤں کے جذبات کو ابھارا گیا، جس کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان لازمی طور پر باہمی نفرت پیدا ہوئی۔

اس قضیہ کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں انگریز، ہندو اور مسلمان تینوں فریق بن گئے تھے، انگریز اس لئے کہ انہوں نے ہی ہندوؤں کو یقین دلایا کہ ان کے مندروں کو منہدم کر کے مسجدیں بنائی گئیں اور پھر اس جھگڑے کو چکانے کے لئے ان ہی کی

فوج سرگرم عمل رہی، جیسا کہ آگے ذکر آئے گا، ہندو اس لئے فریق ہو گئے کہ ان کا مطالبہ ہوا کہ جن مندروں کو توڑ کر مسجدیں بنائی گئیں ہیں ان کی تعمیر از سر نو ہو اور مسجدیں مسمار کر دی جائیں، مسلمان یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے، ان کی دلیل تھی کہ یہ صحیح نہیں کہ یہ مسجدیں مندروں کو توڑ کر بنائی گئی ہیں، یہ باتیں محض زبانی روایتوں سے مشہور کی گئی ہیں، جن کا ثبوت مستند معاصر تاریخوں میں نہیں، بہت بعد کی کسی کتاب میں ان کا ذکر ہے، تو وہ قابل قبول نہیں، ان کا اصرار یہ رہا کہ جن مسجدوں میں برابر نمازیں ہوتی رہی ہیں، ان میں اسی طرح نمازیں پڑھی جانی چاہئیں۔

اجودھیا میں یہ جھگڑا ۱۸۵۵ء میں شروع ہوا، اس کا عجیب و غریب پہلو یہ ہے کہ اس وقت سے اب تک کوئی ہندو مورخ یا دانشور اپنی کسی معاصر ہندی یا سنسکرت ماخذ سے یہ ثابت نہیں کر سکا کہ اجودھیا کی مسجدیں مندروں کو توڑ کر بنائی گئیں، ہندو صرف زبانی روایتوں، یا انگریزوں کی گڑھی ہوئی تحریروں سے مشتعل ہوتے رہے ۱۹۶۰ء میں یوپی کی حکومت کی طرف سے جو گزیٹیر شایع ہوا، اس میں اجودھیا کے مسجد و مندر کے تنازعہ کے سلسلہ میں کسی ہندی یا سنسکرت ماخذ کا حوالہ نہیں، اگر حوالے ہیں تو مسلمانوں کی لکھی ہوئی تصانیف مرزا جان کی حدیقۂ شہدا اور کمال الدین حیدر حسنی الحسینی المشہدی کی قیصر التواریخ یا تواریخ اودھ کے ہیں۔

حدیقۂ شہداء کا مصنف مرزا جان اجودھیا کے ۱۸۵۵ء کے خون ریز تصادم کی مہم میں شریک تھا، اس کی یہ کتاب فوراً ہی ۱۸۵۶ء میں چھپی، اس میں اس کا انداز بیان مورخانہ کے بجائے اسی قسم کا مجادلانہ اور جنگ جویانہ ہے، جو جنگ و جدل کے زمانہ کی فضا میں عموماً ہوا کرتا ہے ۱۸۵۵ء کے تصادم میں مسلمانوں کو جو شکست ہوئی اور ان کا جو قتل عام ہوا، اس سے وہ بہت ہی دلگیر، آزردہ اور مشتعل نظر آتا ہے، اسی لئے اس کی اس کتاب میں بڑا غصہ، طنز تضحیک، تحقیر قلم کی شرر باری اور تحریر کی بے اعتدالی ہے اور اس نفرت کا بھی اظہار ہے، جو

انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پیدا کی تھی، اس کی کتاب وہاں کی پرا
مسجدوں کے زمانۂ تعمیر کے لئے مستند اور معتبر ماخذ نہیں کہی جاسکتی کیوں کہ بابر یا عالم گیر کے
عہد سے بہت بعد میں مرتب ہوئی، دوسری کتاب قیصر التواریخ یا تواریخ اودھ جو بقول اس
کے مصنف ہنری ایلیٹ سکریٹری اعظم وزیر جنرل بہادر کشور ہند کے ایما پر لکھی گی اور
۱۸۹۶ء میں چھپی، یہ ہنری ایلیٹ وہی ہے جس نے ہسٹری آف انڈیا از ٹولڈ بائی اٹس اون
ہسٹورین (History of India is told by its own historian) کی دس جلدیں
لکھ کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وہ نفرت پیدا کی جو آج تک دور نہ ہو سکی، ظاہر ہے
کہ اس کے ایماء سے جو کتاب لکھی گئی ہوگی اس میں بھی وہی نفرت دکھائی دے گی، جس کے
خواہاں انگریز تھے، پھر بھی ان دونوں کتابوں کی ایسی تحریروں کو نظر انداز کر دیا جائے، تو ان
سے بعض مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، ان ہی کو ہم یہاں پر سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حدیقۂ شہداء کے مصنف کا بیان ہے کہ اجودھیا میں رام دربار کی مسجد فدائی خان صوبہ دار نے بنائی تھی، اس کو ہندوؤں نے یہاں تک مٹایا کہ ایک دو منارے اور ایک کنارے پر تھوڑی دیوار رہ گئی، امجد علی شاہ کے وقت میں ان کی تعمیر کا حکم ہوا تھا، مگر موت نے ان کو فرصت نہ دی، (ص ۵ لکھنؤ ایڈیشن) قلعہ کی مسجد پر پچھمن مہنت نے قبضہ کر لیا ہے اور وہاں مسلمانوں کا گذر نہیں، (ایضاً) ان دونوں مسجدوں کے انہدام کے بعد بیراگیوں کی نظر ہنومان گڑھی کی مسجد پر رہی، حدیقۂ شہداء کے مصنف کا بیان ہے: حسب دستور وہاں (یعنی ہنومان گڑھی میں) اورنگزیب غازی نے ایک مسجد بنوادی تھی، ہندوؤں کو اس مسجد کے مٹانے میں اصرار رہا۔ (ایضاً ص ۵)

اگر وہاں مندر تھا تو اورنگزیب مندر کو توڑ کر مسجد نہیں بنوا سکتا تھا، اس نے فتاویٰ عالمگیری بڑی محنت سے مرتب کرایا تھا، اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ کسی غاصبانہ قبضہ کی زمین پر مسجد نہیں بنائی جاسکتی ہے، سر جدوناتھ سرکار اورنگزیب کے بڑے ناقد اور معاند ہیں،

وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس جگہ کی نشان دہی کرتے ہیں جہاں اورنگزیب نے مندر کو منہدم کیا، اورنگزیب کے توڑے ہوئے مندروں کی فہرست میں سرجدوناتھ سرکار اجودھیا کے کسی مندر کے انہدام کا ذکر نہیں کرتے، پھر قیصر التواریخ میں اس سلسلہ میں ایک محضر کا ذکر ہے، جس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مسجد حال ہی میں بنی تھی۔ (ص ۱۱۲)

اس مسجد کا انہدام جس طرح ہوا، اس کی جو تفصیل حدیقۂ شہداء کے مصنف نے لکھی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب پچھم رالٹھ کا ناظم درشن سنگھ برہمن ہوا تو اس نے ہنومان گڑھی کے ٹیلہ میں ایک احاطہ کھنچوایا اور وہاں لڑائی کا ایک قلعہ بنوایا، اس کی وجہ سے وہاں کے بیراگی روز بروز زور پکڑتے گئے اور مسجد کی صورت بگاڑنے لگے، اس مسجد کا ایک حصار بنوا کر اس کا نام ہنومان گڑھی رہا، صبح وشام اس میں پرستش کے مشعل جلانے لگے، پھر اس کے طاق محراب اور منبر کو توڑ کر مسجد کا نام ونشان مٹا دیا۔ (حدیقۂ شہداء ص ۷۔۶)

قیصر التواریخ یعنی تاریخ اودھ میں اس مسجد کے انہدام کا ذکر اس طرح ہے:

> ''زمان سابق میں اودھ کی بلندی پر جس کا نام ہنود نے ہنومان گڑھی رکھا ہے، ایک مسجد بنائے سلاطین ماضیہ تھی، ایک فقیر مسلمان اس کی جاروب کشی کیا کرتا تھا اور پہلوئے مسجد میں بڑا چبوترہ تھا، اس پر عشرہ محرم میں تعزیہ رکھتا تھا، بعد ایک مدت کے ایک فقیر ہندو بھی املی کے نیچے جھنڈی گاڑ کر رہا، ایک چھوٹی سی کوٹھری بنائی، اس میں بت رکھ کر مقام ہنومان قرار دیا، عہد جناب غفران مآب نواب برہان الملک بعض ہنود کوتاہ اندیش نے مسجد جو بلندی مذکور پر تھی، اسے منہدم کر دیا تھا، فوج قاہرہ سرکاری پہنچی، ان کوتاہ اندیشوں کو سزائے اعمال دے کر بت خانہ کو توڑ کر بدستور سابق بنائے مسجد قائم کی، بعد مرور ایام بیراگیوں نے پھر بت خانہ بنایا، مسجد سے کچھ معترض نہ ہوئے، جب تک حکومت پچھم رالٹ وغیرہ

علاقہ سرکار سے راجہ درشن سنگھ بہادر کو ہوا، کفار اس دیار کو قوت و ثروت زیادہ ہوئی، اس مسجد کو گرا کر مکان گڑھی میں ملالیا اور مسجد واقع رام گھاٹ دربار کو خراب کر کے اس کے صحن میں اپنے مسکن بنانے اور اس کے اندر کوڑا ڈالنے لگے اور سینکڑوں مقابر اہل اسلام کو توڑ کر ان کی اینٹیں اور پتھروں سے بڑی شان وشوکت سے بت خانے بنائے، یہاں تک کہ مسجدیں پست اور بت خانے بند ہو گئے۔(ج ۲ ص ۱۱۰)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی دو مسجدیں شہید کی گئیں، ان مسجدوں کے انہدام سے مسلمانوں میں بڑا اضطراب پیدا ہوا، ان کی بازیابی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، ان کی سربراہی پہلے شاہ غلام حسین نے کی، انہوں نے اپنا مورچہ بابری مسجد کو بنایا، وہاں الگونڈر آرا پنے فوجیوں کو لےکر آ گیا، پھر اس کی مدد کے لئے فیض آباد سے جان ہرسی آ گیا، تو بقول مصنف حدیقۂ شہداء بیراگیوں کا گروہ زیادہ شاد ہوا، کیوں کہ ان کو یقین تھا کہ انگریز ان کے طرف دار ہیں اور ان کو نقصان نہ پہنچائیں گے، بیراگیوں نے یکا یک مسجد (یعنی بابری مسجد) پر حملہ کر دیا، خوں ریز تصادم ہوا، مگر مسلمان لڑتے ہوئے ہنومان گڑھی کے دروازے تک پہنچ گئے، بیراگی کافی تعداد میں مارے گئے، مسلمان مسجد میں لوٹ کر آئے تو الگونڈر اور جان ہرسی نے ان کو کہلا بھیجا کہ اب کمر کھول کر بخاطر جمع اپنی مسجد میں رہیں، ان سے اس وقت تک کوئی نہ بولے گا جب تک مسجد (یعنی ہنومان گڑھی کی مسجد) کا فیصلہ نہ ہو جائے گا، ان کی باتوں پر اعتماد کر کے وہ کھانا کھانے میں مشغول ہو گئے، دونوں انگریزوں نے مسجد کے پاس سے اپنی فوج ہٹا کر دور جا کر قیام کیا، گویا بیراگیوں کو پھر حملہ کرنے کا موقع فراہم کرنا تھا، پھر تو ہزاروں کی تعداد میں بیراگی مسجد کے اندر گھس آئے اور مسلمانوں کو قتل کر کے مسجد کے صحن کو لالہ گوں بنا دیا، ان کو اس طرح ذبح کیا جس طرح قصائی گائے ذبح کرتا ہے، قرآن مجید کے پاروں کو جلایا، پھر مسجد کے باہر نکل کر لاشوں کو کچلتے ہوئے گھر کی

راہ لی، حدیقۂ شہداء کے مصنف کا بیان ہے کہ پلٹنیں دیکھا کیں، کھڑی رہیں، کوئی ایسا نہ تھا جوان کی خبر لیتا، یہ پلٹنیں الگونڈر اور جان ہرسی ہی کی تو تھیں، دوسرے دن نثار حسین کوتوال نے اسی مسجد کے دروازہ پر گڑھا کھود کر لاشوں کو توپ دیا، (حدیقۂ شہداء ص ۱۸۔۱۰)

اس سانحہ کی تفصیل تواریخ اودھ میں مرزا اعلیٰ علی کی زبانی اس طرح درج ہے، جو اس موقع پر موجود تھے:

''دونوں انگریز اور میں خود اور مرزا نثار حسین مع اپنی سپاہ اور توپ وہاں سے ہٹ کر بڑی دور درخت کھرنی کے نیچے جا کر کھڑے ہوئے، ایک ساعت نہ گذری تھی کہ بیراگی ہزاروں گولر سے نعرہ مارتے آ کر مسجد کو گھیر لیا او رجب علی شاہ فقیر کے کوٹھے سے چڑھ کر غلام حسین کے ہمراہیوں پر گولیاں برسانا شروع کیا اور مسجد میں آ کر ۲۶۹ آدمیوں کو ذبح کیا اور ٹکڑے ٹکڑے کردیے، مسجد میں لہو بہنے لگا اور قرآن شریف کو جو اکثروں کے حمائل تھا، پُرزے پُرزے کرکے معاذ اللہ پاؤں سے روندا اور جلا دیا، چنانچہ واسطے تصدیق کے جلے ہوئے ورق بھی ملفوف سرکار کئے اور جنگلہ جو حکم سرکار سے چبوترہ جامع مسجد پر تیار ہوا تھا، توڑ ڈالا اور دیوار مسجد کو جزائروں سے چھلنی کردیا، مقتولین کی لاش بے گور وکفن پڑی رہ گئیں، دوسرے دن مرزا نثار حسین نے در مسجد پر ایک بڑا غار کھدوا کر گل در گل دفن کردیا۔ (ج ۲ ص ۱۱۲)

اس قتل عام اور مسجد بابری کی بے حرمتی کے بعد حدیقۂ شہداء، کے مصنف کا بیان ہے کہ بیراگیوں نے مسجد کے صحن میں آ کر ہوم کیا، سنکھ بجایا، وہیں بیٹھ کے موہن بھوگ کھایا اور کہتے تھے کہ ہنومان جی نے کرپا کی، ملیچھوں سے اجودھیا کو پاک کیا، غرض کوئی بے ادبی اٹھا نہ رکھی، متصل اس مسجد کے ایک ٹیلہ تھا، مسلمانوں کی دعاؤں کا وسیلہ تھا، خواجہ مٹی یا میٹھے؟

اس کا نام تھا، مقابر شہداء کا مقام تھا، قبروں کو کھود کے نیست و نابود کر دیا اور ایک بت مٹی وہاں دھر دیا بعضے کہتے ہیں کہ بیراگیوں کی کیا حقیقت تھی کیا ان کی طاقت تھی یہ افعال قبیح مان سنگھ کے لوگوں سے سرزد ہوئے۔ (ص ۱۴)

یہ مان سنگھ بظاہر نواب واجد علی کا وفا کیش تھا مگر وہ دراصل انگریزوں کا خاص آدمی تھا ان ہی کے حکم پر چلتا تھا اسی واقعہ کو تواریخ اودھ میں اسی طرح درج کیا گیا ہے بیراگی جوتا پہنے مسجد میں آئے ہوم کیا سنکھ بجایا بہت بے ادبیاں کیں اس کے قریب خواجہ میٹھے کی قبر اور شہدائے سید سالار کی تھی اسے توڑ ڈالا، ظاہر ہے کہ جمعیت بیراگیوں کی اس قدر نہ تھی لیکن سیکڑوں دوڑے، ملازم راجہ مان سنگھ اور پانڈے راجہ کشن دت اور زمین داران گردو پیش مدد کو پہنچے، دس بارہ ہزار کی کثرت ہوگئی (ج ۲ ص ۱۱) ان کے مقابلہ میں شاید تین سو مسلمان مسجد کے اندر تھے، انگریز ریزیڈنٹ کی فوج دیکھتی رہی، وہ کیوں مداخلت کرتی، ان کے منشا کے مطابق یہ بلوہ ہو رہا تھا، اس تصادم کا عجیب و غریب پہلو یہ تھا کہ بیراگیوں نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ ہنومان گڑھی میں کوئی مسجد تھی، پھر یہ الزام جاتا رہتا ہے کہ اورنگ زیب نے وہاں مندر کو توڑ کر کوئی مسجد بنائی لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہاں ایک مسجد تھی، تواریخ اودھ کے مصنف کا بیان ہے کہ ہنومان گڑھی میں مسجد کو بہت سے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بلکہ اس میں نماز پڑھی ہے اور سیکڑوں برس کا محضر قاضی یار علی ابن الدین، قاضی حبیب اللہ کے پاس موجود ہے۔ (ایضاً ص ۱۱۲)

اس مسجد کی بازیابی کے لئے مسلمان مولوی امیر علی امیٹھوی کی سرکردگی میں اس لئے اٹھے کہ آج ہندوؤں نے ہنومان گڑھی کی مسجد کھودی ہے، اگر ایسے ہی مسلمان بودے ہوئے تو کل لکھنؤ میں عمل کریں گے، ہر خانہ خدا میں ایک بت دھر دیں گے (حدیقۂ شہداء ص ۱۸) مولوی امیر علی امیٹھوی اپنے جان نثاروں کے ساتھ بڑھے، پہلے نواب واجد علی شاہ سے گفت و شنید ہوئی، ایک ملاقات کا ذکر حدیقۂ شہداء کے مصنف نے اس طرح کیا ہے:

''نواب نے ارشاد کیا کہ آپ اتنی جلدی کیوں کرتے ہیں، ہم کو آپ سے زیادہ خیال ہے، واللہ کفار کی زیادتیوں کا بڑا ملال ہے مگر کیا کریں، قابو نہیں، صاحب کلان سے مجال گفتگو نہیں، جب سے کلام اللہ جلنے کو سنا ہے دل کباب ہو گیا ہے، کلیجہ پھٹتا ہے لیکن آپ کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا کلام یاد نہیں، دیر آید درست آید، کیا قول استاد نہیں، آپ تھوڑے ہی دن تامل کریں، روانگی میں تساہل کریں، ہم حکمت عملی سے مسجد بنوادیں گے اور انتقام بے ادبیوں کا بھی لیں گے۔ (ص ۲۵)

اوپر کے اقتباس میں صاحب کلان سے مراد انگریز ریزیڈنٹ ہے، اس سے ظاہر ہے کہ انگریزوں کے اشارے سے سب کچھ ہو رہا تھا، نواب واجد علی کے قابو سے سب کچھ باہر تھا، وہ تو ان سے گفتگو بھی نہیں کر سکتے تھے، مولوی امیر علی امیٹھوی کو نواب واجد علی کی بے بسی کا پورا احساس ہوا، ان کی گفتگو کو حیلہ جوئی سمجھ کر اپنے عزم کو پورا کرنے کے لئے تیار ہو گئے، اس مہم کی بڑی لمبی تفصیل حدیقۂ شہداء اور تواریخ اودھ میں ملے گی کہ کس طرح مولوی امیر علی آگے بڑھے اور لڑے مگر ان کو فریب میں مبتلا کیا گیا، یہاں تک کہ وہ انگریز کے فوجی سردار بارلو کی توپوں کی زد میں آگئے، بارلو نے ان کو جس طرح ختم کیا ہے اس کا حال حدیقۂ شہداء اور تواریخ اودھ میں تفصیل سے ملے گا، حدیقۂ شہداء میں ہے کہ بارلو کی توپوں سے موت کی گرم بازاری ہونے لگی تو وہ دن روز رستاخیز سے کم نہ تھا، زمین و آسمان درہم برہم تھا، ساکن آسمان الامان کہتے تھے، بے گناہوں کو ذبح ہوتے دیکھ کر فرشتے کل یوم ھو فی شان کہتے تھے، امیر المجاہدین یہ کہتے ہوئے شہید ہوئے ع:

سر میداں کفن بردوش دارم (ص ۵۷)

''بارلو کے ساتھ گونڈہ کے تعلقہ دار بھی ہو گئے، تواریخ اودھ میں ہے کہ:

"مولوی صاحب اپنے سجادے پر روبقبلہ گرے اور ابتداء سے ان کی دعا تھی کہ میں کسی مسلمان کے ہاتھ سے نہ مارا جاؤں (یعنی نواب کے کسی لشکری کے ہاتھ سے) خدا نے ان کی دعا مستجاب کی، باقی نمازی گردان کی نعش کے پڑے تھے، مثل بنات النعش ملنگوں نے دوڑ کر بارلو سے کہا کہ مجاہدین کا کام تمام کیا، ایک تلنگہ مولوی صاحب کا سر کاٹ کر لایا، بارلو نے اسی وقت ازراہ فخر و فتح و فیروزی سمجھ کر روانہ سرکار کیا، جب حضور عالم کو خبر ہوئی حکم کیا یہاں کیوں سر کو لائے؟ اب چاہتے ہو لکھنؤ میں بھی کوئی ہنگامہ برپا ہو، دو تلنگے اور شتر سوار یہ سر لے کر آئے تھے، حکم ہوا کہ اس سر کو دھڑ کے ساتھ جا کر بعد ملاحظہ کرانے بڑے صاحب کے (یعنی ریزی ڈنٹ جنرل) دفن کردو، یہ ڈرے کہ اگر پھر لے کر جاویں گے، مبادا کوئی مجاہد اسے دیکھ کر چھین لے اور ہمیں مار ڈالے، بڑے صاحب کو ملاحظہ کرا کے معلوم نہیں کہاں سر کو پھینک دیں، سیدھے بارلو کے پاس چلے گئے"۔ (ص ۱۲۷-۱۲۶)

اوپر کی لمبی تفصیل سے ناظرین شاید گھبرا اٹھے ہوں گے مگر اسی پس منظر میں بابری مسجد کا قضیہ سمجھ میں آئے گا، وہ اب خود فیصلہ کریں کہ ہنومان گڑھی کے خون ریز تصادم میں اصلی فاتح کون تھے، بلاشبہ الگزنڈر آر جان ہرسی، بارلو اور اودھ کے ریزیڈنٹ جنرل یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز تھے۔ انہوں نے ہی اجودھیا میں مسجد مندر کا تنازعہ کھڑا کیا اور مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کو اس لئے خوش کیا کہ وہ مسلمانوں سے حکومت چھیننے میں ان کی مدد کریں گے اور کم از کم اجودھیا کے تصادم میں تو ان کی پوری مدد کی، اجودھیا کے بیراگیوں نے انگریزوں کے زیر سایہ تین چار مسجدوں کو شہید کر لیا تھا، تو ان کے حوصلے بابری

مسجد پر قبضہ کرنے کے لئے کیوں نہ بڑھتے، وہ اس کے اندر گھس کر ہوم کر چکے تھے، سنکھ بھی بجا چکے تھے اور موہن بھوگ بھی کھا چکے تھے، اب صرف اس کو توڑ کر یا تو اور مسجدوں کی طرح صفحۂ زمین سے مٹانا یا اس کو مندر میں منتقل کرنا باقی رہ گیا تھا، مگر اجودھیا کے مسلمان اپنی پسپائی اور قتل عام کے باوجود اپنی ایمانی حرارت اور ملی حمیت کو اپنے سینوں سے لگائے ہوئے تھے، اس شکست و ہزیمت کے بعد انہوں نے مسجد کو بیراگیوں سے خالی کرایا اور پھر اس کی حفاظت کے لئے مذہبی، قانونی، دستاویزی اور عدالتی سطح پر ہندوؤں سے برابر لڑتے رہے، جیسا کہ آیندہ کی تفصیلات سے معلوم ہوگا، انگریز ہندوؤں کی پشت پناہی اور حوصلہ افزائی ضرور کرتے رہے، مگر ان کو جنم استھان کو مسلمان کرکے بابری کی تعمیر کا کوئی معاصر و مستند ثبوت نہیں ملا، اس لئے مسلمانوں کو بے دخل کرا کے اس کو ہندوؤں کے حوالے نہ کر سکے، گو وہ ہندوؤں کو یہ کہہ کر ورغلاتے رہے کہ یہ مسجد جنم استھان ہی کو توڑ کر بنائی گئی ہے، اس کے لئے اپنے گزیٹیر میں تحریریں بھی لکھتے رہے، مگر گزیٹیر کی تحریریں مستند اور مؤثر ثابت نہیں ہوئیں، انگریزوں کی حکومت باضابطہ ہوگئی تو ان کے زمانہ میں یا ان کی حوصلہ افزائی سے بیراگی کبھی مسجد میں گھس آتے، وہاں مورتی بھی رکھ دیتے، پوجا پاٹ بھی کر لیتے، مگر ان کے خلاف عدالتی کارروائی کی جاتی تو وہ شکست کھا جاتے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، انگریزوں کی یہ بھی مصلحت رہی کہ وہ اس جھگڑے میں دونوں کو الجھائے رکھیں تاکہ وہ دونوں کے مذہبی جذبات کا استحصال اپنے سامراجی مقاصد کے لئے کرتے رہیں۔

اب اس تنازعہ کو ذرا مقدمہ کی مثل کے ذریعہ سے ناظرین سمجھیں، پہلے ہم مقدمہ کی درخواستیں نقل کریں گے، پھر ان پر تبصرہ کریں گے تاکہ صورت حال کی وضاحت ہو۔

۱۸۵۸ء کے مقدمہ کی ایک درخواست: نقل درخواست محمد اصغر خطیب و مؤذن مورخہ ۳۰ نومبر ۱۸۵۸ء مجریہ نمبر ۸۸۴ محلہ کوٹ رام چند اجودھیا..... عرضی ..... در

دوبارہ کھڑا کرنے نشان در مسجد جنم استھان منعقدہ ۱۵؍دسمبر ۱۸۵۸ء۔

غریب پرور! سلامت جناب عالی! سانحہ جدید سرزد ہوا ہے کہ مسمی بیگ سنگھ ......ملازم سرکار دولت مدار۔ باعبوری بیراگیان جنم استھان کا بانی فساد ہے، بیچ مسجد بابری واقع اودھ قریب محراب ومنبر کے ایک چبوترہ مٹی کا بہ بلندی چہار انگشت بنا کی......مامور کرکے......آتش کے مصروفیات ہے، چبوترہ مسجد اندر کٹہرہ اوپر چبوترہ کے چبوترہ جدید ......مدد موقوف ہوئی، یہ بلندی تقریباً سوا گز کا تیار کرکے نشان وتصویر بت ایستادہ کیا ہے وہ برابر اس کے ایک گڑھا کھود کر منڈیر پختہ کروا اس کی تیار کرکے آتش روشن کی ہے، پوجہ وہوم میں مصروف ہیں اور جا بجا مسجد میں کوئلہ سے رام رام لکھا ہے، عادل رعایا یہ مقام انصاف کا ہے کہ صریح ظلم وزیادتی اہل ہنود اہل اسلام پر کرتے ہیں وہ حضور پالک فریقین کے ہیں، مضمون......سے ہی صاف مترشح ہے کہ مذہب پر کوئی فریق تعرض نہ کرے......مبادرت کرے گا تو سرکار سے سزایاب ہوگا۔

جناب عالی! مقام غور کا ہے، مسجد مقام عبادات مسلمانان ہے کہ بخلاف اس کے کچھ ہنود کی سابق میں قبل بلوہ عملداری سرکار مقام جنم استھان کا صدہا برس سے پریشان پڑا رہتا تھا، اہل ہنود پوجا کرتے تھے، چبوترہ بہ سازش بنی غلام تھانہ دار اودھ کے بیراگیوں نے شباشب میں تا صدور حکم سرکار کے واسطے مخالفت کے نافذ ہوا تھا، بہ بلندی ایک بالشت تیار کرالیا، اس وقت جناب ڈپٹی کمشنر بہادر کے بموجب حکم جناب کمشنر نے تھانہ دار کو موقوف کیا وہ بیراگی پر جرمانہ بھی ہوا، اب فی الحال روشن چبوترہ کو ہی تخمیناً سوا گز تیار کرالیا ہے، اس صورت صریح زیادتی ثابت ہے، لہذا امیدوار ہوں کہ بنام مرتضی خان کوتوال شہر صدور حکم ہو وے کہ کوتوال بچشم خود معائنہ کرکے امورات جدید کھدوا ڈالیں ومردمان ہنود کو بیرون مسجد کے کریں، واجب جان کر عرض کیا،...... بندہ محمد ......خطیب وموذن مسجد بابری واقع

اودھ مورخہ ۳۰ر نومبر ۱۸۵۸ء (نوٹ) اصل کاغذ جا بجا پھٹ گیا ہے۔

تبصرہ: اس درخواست میں یہ بات کہی گئی ہے کہ بیراگیوں میں سے ایک نے مسجد کے اندر محراب و منبر کے پاس مٹی کا ایک چبوترہ بنالیا ہے، اس کے برابر ایک گڈھا کھود کر پختہ منڈیر بھی تعمیر کرلی ہے اور اس پر آگ روشن کر کے پوجا و ہوم کیا جاتا ہے، مسجد میں کوئلہ سے رام رام لکھ دیا گیا ہے، اس کی دادرسی طلب کی جاتی ہے، پھر اسی درخواست میں یہ بات یاد دلائی گئی ہے کہ مسجد کے ملحق جنم استھان سیکڑوں برس سے خالی پڑا تھا اور وہیں آکر ہندو پوجا کرتے تھے لیکن بیراگیوں نے تھانیدار کی سازش سے وہاں پر ایک چبوترہ بنالیا تھا، ڈپٹی کمشنر نے اس سلسلہ میں تھانیدار کو موقوف کیا اور بیراگیوں پر جرمانہ کیا، مگر چبوترہ توڑا نہیں گیا، بلکہ ایسا ہی رہنے دیا گیا، جس کے بعد اس کو بیراگیوں نے اور بڑھا لیا، اس سے ظاہر ہے کہ جنم استھان کی جائے وقوع مسجد سے باہر تھی جہاں مسجد بنی ہے وہ جگہ نہ تھی اس مقدمہ میں جو فیصلہ ہوا وہ تو نہ مل سکا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے اندر جو چبوترہ بنالیا گیا تھا وہ عدالت کے حکم سے منہدم کرادیا گیا، کیوں کہ آگے ۱۸۶۰ء میں جو درخواست خطیب اور مؤذن کی طرف سے دی گئی اس میں مسجد کے اندر چبوترہ کا ذکر نہیں۔

مسجد کا رجسٹریشن ۱۸۶۰ء: اس جھگڑے کی وجہ سے احتیاطاً ۱۸۶۰ء میں یہ مسجد باضابطہ رجسٹرڈ کرالی گئی، اور ۱۸۶۰ء کے مثل بند رجسٹرار کے یہاں یہ بابری مسجد کی حیثیت سے درج ہے۔

اس کے بعد ۱۸۶۰ء میں میر رجب علی خطیب بابری مسجد کی طرف سے نومبر ۱۸۶۰ء میں ایک درخواست پڑی جس کی نقل ذیل میں درج ہے:

۱۸۶۰ء کے مقدمہ کی ایک درخواست: نقل درخواست میر رجب علی خطیب مسجد بابری مورخہ یکم نومبر ۱۸۶۰ء .... نمبر ۱۱۵ محلہ کوٹ رام چندر، اجودھیا،

میر رجب علی بہ نام اقبال سنگھ۔

مورخہ ۹؍مارچ ۱۸۶۱ء میر رجب علی مسجد بابری ساکن اودھ۔

غریب پرور سلامت ! عرضی ہذا جو چبوترہ نیا قریب مسجد بابری، اقبال سنگھ

کے بعد ملاحظہ مضمون........

واقع اودھ مدعی علیہ نے بنایا ہے، بعد تحقیقات منہدم فرمایا جائے و نیز مچلکہ مدعی علیہ سے عدم مزاحمت واسطے دادرسی.... حلف لے لیا جائے، فقط مدعی..... مدعا علیہ کا، مگر پاس حضور میں گذارش کروں کہ عرصہ قریب بیس روز کے ہوئے مدعی علیہ نے ایک چبوترہ از راہ زبردستی خلاف و عمل درآمد..... ملحقہ مسجد بابری میں پاس قبر قاضی قدوہ مرحوم کے بنالیا ہے، وہ ہر روز چبوترہ بڑھاتا جاتا ہے، حالاں کہ اس کو منع کیا جاتا ہے، مگر کسی طرح باز نہیں آتا، بلکہ آمادہ ہنگامہ و تکرار ہوتا ہے، فدوی بخوف سرکار طرح دیتا ہے، سابقاً عرصہ قریب ڈیڑھ برس کے ہوا ہوگا کہ ہری داس مہنت ہنومان گڑھی زبردستی مکان بنانا چاہتا تھا، کہ وہ مقدمہ دائر عدالت ہو کر ڈگری بحق ہم مدعی صادر ہوئی، و فیصلہ ضلع تا محکمہ عالیہ کمشنری بحال رہا، بلکہ مچلکہ عدم مزاحمت ہری داس مذکور سے کیا گیا کہ وہ مثل سر رشتہ میں موجود ہے، و بعہد ڈپٹی کمشنر جناب...... فورڈ صاحب بہادر مدعی علیہ مذکور نے جھنڈا واسطے برپا ہونے نزاع کے قریب مسجد کے یعنی صحن میں نشست کیا تھا کہ جناب صاحب محتشم بعد ملاحظہ جھنڈا نصب ساختہ مدعی علیہ اکھڑوا ڈالا، نیز فہمایش فرمایا تھا لیکن..... مدعی علیہ از راہ عدول حکمی سرکار مرتکب امر ہوا ہے اور ورثائے قبرستان..... بہت پریشان ہیں، علاوہ اس کے جب موذن مسجد میں اذان دیتا ہے تو وہ ناقوس یعنی سنکھ بجاتا ہے، تو عالی جناب! ایسا کبھی نہیں ہوا اور سرکار حاکم دونوں فریق کے ہیں، لہٰذا درخواست ہذا حضور میں گذار کر امیدوار ہوں کہ مدعی علیہ کو حرکت بیجا سے باز رکھا جائے، بعد تحقیقات چبوترہ جدید تعمیر ساختہ مدعی علیہ کہ جو

کبھی وہاں نہ تھا، نیا بنالیا ہے، منہدم فرمایا جاوے، و نیز مقدمہ مچلکہ سے عدم مزاحمت دی جائے، سنکھ وقت اذان مدعیٰ علیہ سے لے لیا جائے، ہم غریب مدعیٰ علیہ سے نجات پائیں، واجب جان کر عرض کیا۔

میر رجب علی خطیب مسجد بابری واقع اودھ ساکن اودھ۔ مورخہ یکم نومبر ۱۸۶۰ء

تبصرہ: اس درخواست سے ظاہر ہے کہ اقبال سنگھ مدعاعلیہ نے مسجد سے ملحق ایک چبوترہ بنالیا ہے اور اس کو بڑھاتا جاتا ہے، اس کو عدالت سے روکے جانے کی درخواست کی گئی ہے، پھر اس میں یہ بھی ہے کہ ہنومان گڑھی کا مہنت ہری داس مسجد کے پاس ایک مکان بنانا چاہتا تھا، مگر سرکاری حکم سے اس کو روکا گیا، اس درخواست میں یہ بھی ہے کہ مسجد کے اندر ایک جھنڈا لہرایا گیا لیکن سرکاری حکم سے یہ اکھڑوا دیا گیا، اس سے ظاہر ہے کہ مسجد کو مسلمانوں کی مسجد تسلیم کر کے یہ جھنڈا وہاں سے اکھڑوایا گیا، اس درخواست میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب مسجد میں مؤذن اذان دیتا ہے تو اس وقت سنکھ بجایا جاتا ہے، جو پہلے کبھی نہیں بجایا جاتا تھا، درخواست میں التجا کی گئی ہے کہ چبوترہ وہاں نہ بننے دیا جائے اور اذان کے وقت سنکھ بجانے سے روک دیا جائے، اس کے بعد معاملہ کی تفتیش کرائی گئی، اس کی رپورٹ کی نقل حسب ذیل ہے:

۱۸۶۰ء کے مقدمہ کی ایک رپورٹ: نقل رپورٹ مورخہ ۱۹/دسمبر ۱۸۶۰ء مقدمہ مثل نمبری ۱۱۵ موقع محلہ کوٹ رام چندر اجودھیا میر رجب علی بنام اقبال سنگھ مفصلہ ۱۸/ مارچ ۱۸۶۱ء۔

تعمیل حکم ہذا کریں کہ مسکن اقبال سنگھ مدعیٰ علیہ پر جا کر معائنہ کیا تو ایک کٹیا کے جس میں مدعیٰ علیہ رہتا ہے، بنی ہوئی ہے اور آج کل کوئی جدید چبوترہ اس نے نہیں بنایا اور اقبال سنگھ مذکور کو فہمایش کردی گئی کہ اب تا صدور حکم ثانی جناب اسسٹنٹ کمشنر بہادر اب

بنیاد جدید نہ ڈالیں، نہ چبوترہ بڑھائیں اور چوکی داران محلّہ کو تاکید کردی ہے کہ اگر اب آ
یہ مدعیٰ علیہ چبوترہ وغیرہ جدید بناوے تو تھانے پر اطلاع کر کے بحضور بندرگان......گذار
کیا جاوے اور وہ کٹیا جس میں مدعا علیہ رہتا ہے چار مہینہ کی بنی ہوئی ہے اور مضمون پروان
یہ ہے کہ اگر مدعیٰ علیہ ہر روز بڑھاتا ہو یا اور بنیاد جدید چبوترہ پر ڈالے ہو تو بنانے سے باز ک
کرا اٹھا دیوے، صاف کر دیوے۔

مدعا علیہ اب اگر جدید چبوترہ کی بنیاد ڈالے اور بڑھاوے تب مدعا علیہ کو اٹھ
دیوے یا جیسے کہ مدعا علیہ اپنی کٹیا میں جو چار مہینہ کی بنی ہوئی ہے اور رہتا ہے اس میں سے
اٹھادیں، جیسا ارشاد ہو، اس موافق تعمیل ہو، رپورٹ ہذا ارسال حضور ہے۔

مورخہ ۱۹/دسمبر ۱۸۶۰ء

۱۸۶۱ء کے ایک حکم نامہ کی نقل: نقل امور احکام ۷/فروری ۱۸۶۱ء/۱۵/مارچ ۱۸۶۰ء

آج پیش ہو کر حکم ہوا کہ تھانے دار کو لکھا جائے کہ پہلے دریافت کریں کہ جو کٹیا چار مہینہ سے
مدعا علیہ نے بنایا ہے وہ اجازت سرکار سے حاصل کر کے بنایا ہے یا نہیں اور اگر کوئی اجازت
سے نہیں بنائی گئی تو کٹیا اٹھوا دیں۔ المرقوم ۷/فروری ۱۸۶۱ء

تبصرہ: تفتیش کے بعد یہ رپورٹ دی گئی کہ مدعیٰ علیہ نے کوئی نیا چبوترہ نہیں بنایا ہے
اور نہ اس میں اضافہ کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چبوترہ پہلے بنایا گیا تھا، وہی برقرار
ہے، اس کو کہہ دیا گیا ہے کہ سرکاری حکم کے بغیر کوئی اضافہ کیا گیا تو اس کو وہاں سے ہٹا دیا
جائے گا، محلہ کے چوکیداروں کو بھی اس کی تاکید کی گئی کہ یہ کٹیا جو چار مہینوں کی بنی ہوئی ہے
اس کے لئے حکم کیا گیا کہ اس میں اضافہ نہ ہونے پائے اور اگر اس میں اضافہ کیا جائے تو
مدعیٰ علیہ کو ہٹا دیا جائے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بابری مسجد کو مسجد تسلیم کر کے یہ حکم جاری
کیا گیا، کیوں کہ چبوترہ اور کٹیا سے جھگڑا پیدا ہونے کا احتمال تھا، پھر ایک جھگڑا مسجد کی دیوار

ور پھاٹک کے لئے ہوا، اس سلسلہ میں حسب ذیل درخواست کورٹ میں دی گئی۔

۱۸۷۰ء۔ ۱۸۷۷ء کے مقدمہ کی ایک درخواست: نقل درخواست محمد اصغر ۱۸۷۰ء

رگھوبیر منعقدہ ۲۲ر جنوری ۱۸۸۴ء محمد اصغر خطیب و مؤذن مسجد بابری واقع جنم استھان اودھ۔

در جواب صدور حکم جائے دروازہ متعلق سائل..... تیار کیا ہے تو اس کا..... سائل

..... نامنظوری دے دیا جائے...... دروازہ سے متعلق نہیں ہے۔

عادل زمان غریب پرور سلامت...... مسجد بابری واقع جنم استھان اودھ میں حکم

..... دروازہ جدید جانب اتر.... تیار ہو رہا ہے........ دیوار اس کی شکست کروادی گئی ہے،

اب بہ نظر چالاکی کے...... دکھن منھ چبوترہ واسطے قائم کرنے ملکیت اسی دیوار مسجد کی طرح

تیار کی..... پاس ہے........ منصب خاندانی سائل..... خلاف عمل درآمد قائم ہوئی ہے،

کیوں کہ لکھیم داس مہنت و دیگر مہنتان ماسبق کو سوائے چبوترہ کے دوسرے میں مداخلت

نہیں ہے، دیوار احاطہ مسجد کی ہے، کچھ چبوترہ کی نہیں ہے، اس میں اکثر احکام عدالت ہیں

کہ کوئی امر جدید نہ ہونے پائے، اس صورت میں مدعیٰ علیہ کو حکم ہووے کہ وہ کنارہ کش

دروازہ کے ہوویں، و سائل کو اجازت موجودہ ہووے کہ دروازہ و کنجی دروازہ پاس سائل کے

رہے کہ وقت کثرت میلہ آمد و رفت دروازہ کھول دیا کریں، و اگر ضرورت جانیں تو سائل

سے دلوایا جائے ورنہ..... سے دیا جائے، تا کہ باعث رفع تکرار کا ہو جائے لیکن کنجی متعلق

سائل سے رہے، مہنت سے نہ رہے، واجب جان کر عرض کیا۔

فدوی سید محمد اصغر خطیب و متولی مسجد بابری واقع اودھ مورخہ ۳ر اپریل ۱۸۷۷ء

تبصرہ: اس درخواست سے معلوم ہوتا ہے کہ مہنتوں نے کوشش کی کہ مسجد کی ایک دیوار کو توڑ کر اپنی ایک دیوار بنالیں اور اس میں ایک دروازہ لگادیں، کیوں کہ میلے کے موقع پر پورب سے آنے جانے میں مزاحمت کا اندیشہ ہے، اس لئے مسجد کے اتر طرف ایک دروازہ

بنالیں، اس کے بنانے کا مقصد یہ بھی تھا کہ چبوترہ مہنتوں کی ملکیت میں آجائے، مسجد کے خطیب اور مؤذن کی طرف سے یہ درخواست پڑی کہ یہ دیوار مسجد کی ہے، مہنتوں کا اس پر کوئی حق نہیں، انہوں نے اس کی پیش کش کی کہ دروازہ مسجد کا ہو اور اس کی کنجی مسجد کے خطیب کے پاس رہے، میلہ کے موقع پر وہ دروازہ کھول دیا کرے گا تاکہ کوئی تکرار نہ ہو، اس پر جو حکم نامہ صادر ہوا وہ نہیں مل سکا، یہ درخواست بہ ظاہر ۱۸۷۰ء کی معلوم ہوتی ہے۔

پی کارنیگی کی رپورٹ ۱۸۷۰ء: اس مقدمہ بازی کے درمیان انگریزوں کی سامراجی حکومت قائم ہو کر مضبوط ہو چکی تھی، ان کو اب موقع تھا کہ ہندو مسلمان میں باہمی نفرت پیدا کرنے کے سلسلہ میں ہر قسم کی تدبیریں اختیار کریں، انہوں نے اجودھیا میں مسجد اور مندر کا جھگڑا کھڑا کر کے ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے دور کر ہی دیا تھا، اب بابری مسجد اور جنم استھان کا قضیہ جاری تھا، اس کو اور ہوا دینا تھا، جنم استھان کو مسمار کرنے کا کوئی تاریخی ثبوت ہندو اور نہ انگریز پیش کر سکے تھے۔ انگریزوں کو تحریری ثبوت پیش کرنے کی فکر ہوئی، ۱۸۷۰ء میں فیض آباد تحصیل کا بندوبست ہونے لگا تو اس کے سٹلمنٹ افسر اور قائم مقام ڈپٹی کمشنر پی کارنیگی نے ایک رپورٹ پیش کی جس کے کچھ اقتباسات یہ ہیں:

"مقامی طور سے یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے حملہ کے وقت یہاں تین اہم مندر تھے، جن میں تھوڑے سے پجاری رہتے تھے، اجودھیا اس وقت ویران ہو چکا تھا، تین مندر یہ تھے، جنم استھان، سورگ دوار مندر، (جو رام دربار بھی کہلاتا تھا) اور ترتیا کا ٹھاکر جنم استھان وہ جگہ ہے، جہاں رام چندر پیدا ہوئے، سورگ دوار وہ پھاٹک ہے جس سے وہ بیکنٹھ میں گئے، ممکن ہے کہ یہ وہ جگہ ہو جہاں وہ جلائے گئے، ترتیا کا ٹھاکر وہ مقام ہے جہاں رام چندر نے بھینٹ چڑھائی تھی، اس کی یاد میں یہاں اپنی تین مورتیاں اور سیتا کی ایک مورتی رکھوائیں، بابر کی تزک کے لیڈن کے نسخہ کے مطابق یہ شہنشاہ سرجو اور گھاگھرا

کے سنگم پر جو اجودھیا سے دو یا تین کوس پر ہے، ۲۸ / مارچ ۱۵۲۸ء میں قیام پذیر ہوا، وہ یہاں ایک شکارگاہ کا ذکر کرتا ہے جو اودھ سے سات آٹھ کوس پر سرجو کے ساحل پر تھی، یہ بات قابل توجہ ہے کہ بابر کی تزک کے جتنے نسخے ہیں ان میں اجودھیا میں بابر کے آنے کا ذکر نہیں، اس کے وہ اوراق مفقود ہیں، بابری مسجد میں دو جگہوں پر وہ تاریخ لکھی ہے، جب یہ بنائی گئی، یہ ۹۲۵ھ مطابق ۱۵۲۸ء ہے، یہ پتھر پر کھدی ہوئی ہے، اس کے کتبے میں بابر کی شان و شوکت کا ذکر ہے، جنم استھان ہنومان گڑھی سے چند سو قدم کے فاصلہ پر ہے، ۱۸۵۵ء میں ہندو مسلمان دونوں میں سخت جھگڑا ہوا، ہندوؤں نے زبردستی ہنومان گڑھی پر قبضہ کرلیا لیکن مسلمانوں نے جنم استھان پر تسلط کرلیا، مسلمان ہنومان گڑھی کے زینہ تک ضرور پہنچے، مگر وہ کافی نقصان کے ساتھ نیچے ڈھکیل دیے گئے، ہندوؤں نے کامیابی کے ساتھ ان کا پیچھا کیا، تیسری بار جنم استھان پر قبضہ کرلیا، جس کے پھاٹک پر ۷۵ مسلمان مارے گئے اور وہ گنج شہیداں میں دفن کیے گئے، بادشاہ کے کئی فوجی دستے اس سانحہ کو صرف دیکھتے رہے، ان کو حکم تھا کہ وہ مداخلت نہ کریں، یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک ہندو اور مسلمان دونوں اس مسجد، مندر میں عبادت اور پوجا کرتے رہتے تھے، برطانوی حکومت کے زمانہ سے بیچ میں سلاخیں ڈال دی گئیں، تاکہ جھگڑا نہ ہو، مسجد میں مسلمان نماز پڑھیں، سلاخوں سے باہر ہندو اس چبوترہ پر پوجا کریں، جو انہوں نے تعمیر کیا ہے''۔ (ترجمہ از اقتباس انگریزی، شائع کردہ مسلم انڈیا انگریزی، مارچ ۱۹۸۶ء ص ۱۱۹)۔

تبصرہ: اس اقتباس کا تجزیہ ذرا احتیاط سے کرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ آئندہ یہی باتیں فیض آباد کے نئے گزیٹیروں میں دہرائی گئیں، شروع میں یہ کہا گیا ہے کہ:

''مقامی طور سے یقین دلایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے حملہ کے وقت یہاں تین اہم مندر تھے، جن میں تھوڑے سے پجاری رہتے تھے،

اجودھیا اس وقت ویران ہو چکا تھا"۔

یہ باتیں زبانی روایتوں کے سہارے لکھی گئی ہیں، ایک مؤرخ کے سامنے زبانی روایتوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی، اگر ایسی روایتیں مانی جاسکتی ہیں تو رد بھی کی جاسکتی ہیں، ان کا مستند ہونا یقینی نہیں، پھر یہ کہا گیا ہے کہ وہاں تھوڑے پجاری رہتے تھے، اس لئے کہ اجودھیا اس وقت ویران ہو چکا تھا، اس بیان سے ظاہر ہے کہ اجودھیا کے پوتر ہونے کی حیثیت ختم ہو چکی تھی، اس لئے یہ ویران ہو گیا تھا اور مندروں میں تھوڑے سے پجاری رہتے تھے، اس ویران مقام میں ایک مسجد بن گئی تو کون سا جرم سرزد ہوا، اس کے بعد جنم استھان، سورگ دوار اور ترتیا کا ٹھاکر کا ذکر ہے جن کے وجود کو بھی زبانی روایتوں سے یقین دلانے کی کوشش کی گئی، پھر اودھ میں بابر کے آنے کا ذکر ہے لیکن یہ بھی لکھا گیا ہے کہ بابر کی تزک میں اجودھیا آنے کا ذکر نہیں اور جب وہ یہاں نہیں آیا تو ظاہر ہے کہ یہی سمجھا جائے گا کہ اس نے جنم استھان کے مندر کو نہ مسمار کیا اور نہ اس کی جگہ پر مسجد بنوائی لیکن اس بات کو مبہم یہ لکھ کر بنا دیا گیا ہے کہ تزک کے ایسے اوراق مفقود ہیں جن میں بابر کے اجودھیا آنے کا ذکر رہا ہو، ایسے قیاسات ایک مؤرخ کے لئے قابل قبول نہیں، یہ صرف فتنہ کو تقویت پہنچانے کے لئے لکھا گیا ہے، اوپر کے اقتباسات میں رام جنم استھان کے مسمار کئے جانے کا ذکر نہیں، مگر اشارہ و کنایہ میں یہ بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے، یقین کے ساتھ یہ بات کہی بھی نہیں جاسکتی تھی کیوں کہ اس کا کوئی مستند ثبوت نہیں اور جب یہ لکھا گیا ہے کہ یہ مسجد اس کے کتبہ کے مطابق ۱۵۲۸ء میں بنی اور اس کے کتبہ میں بابر کا ذکر ہے تو اس کو تسلیم کرنے میں کیا شک و شبہہ تھا کہ یہ بابر کے زمانہ میں بنائی گئی، مگر یہ تسلیم کر لیا جاتا تو پھر اس کا قضیہ آگے کیسے بڑھتا، پھر یہ لکھا گیا ہے کہ ۱۸۵۵ء میں ہندو مسلمان دونوں میں سخت جھگڑا ہوا، مگر اس جھگڑے کے اسباب کی تصریح نہیں کی گئی ہے، پہلی نظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جھگڑا

بابری مسجد کی خاطر ہوا لیکن ہم گذشتہ اوراق میں یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ یہ جھگڑا اس مسجد کے لئے ہوا، جس کو ہنومان گڑھی میں ہندوؤں نے مسمار کر دیا تھا، اس جھگڑے کی تفصیل بیان کرنے میں یہ تحریر کیا گیا ہے کہ پہلے ہندوؤں نے زبردستی ہنومان گڑھی پر قبضہ کر لیا، یہاں تک تو ٹھیک ہے، مگر اس میں جب یہ لکھا گیا ہے کہ مسلمانوں نے جنم استھان پر تسلط کر لیا، تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جنم استھان موجود تھا، مسمار نہیں کیا گیا، اسی پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا، مگر جنم استھان سے یہاں پر بابری مسجد مراد ہے، پہلے ذکر آچکا ہے کہ اسی کے پھاٹک پر پچھتر مسلمان لڑتے ہوئے شہید ہوئے، اب سوال یہ ہے کہ اس میں بابری مسجد کے بجائے جنم استھان کیوں لکھا گیا؟ محض اس لئے کہ ہندوؤں کو یہ یقین دلایا جائے کہ بابری مسجد دراصل جنم استھان ہے، اس کو صرف فتنہ انگیزی ہی پر محمول کیا جا سکتا ہے، اس کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ بادشاہ یعنی واجد علی شاہ کے فوجی دستے اس سانحہ کو صرف دیکھتے رہے، ان کو حکم تھا کہ وہ مداخلت نہ کریں، یہ جھوٹ صرف کمانڈر بارلو کی سفاکانہ گولہ اندازی پر پردہ ڈالنے کے لئے ہے، گذشتہ اوراق میں اس کی تفصیل آچکی ہے اور پھر یہ بات تو سراسر افتراء ہے کہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک ہندو اور مسلمان دونوں اس مسجد مندر میں عبادت اور پوجا کرتے رہے تھے، کوئی مسلمان یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ جس عبادت گاہ میں مورتی کی پوجا ہو وہاں نمازیں بھی پڑھی جائیں، یہ بات بھی فتنہ کو ہوا دینے کے لئے کہی گئی ہے اور جب روایت چلی آرہی ہے تھی تو برطانوی حکومت کے زمانہ میں بیچ میں سلاخیں کیوں ڈال دی گئیں کہ مسجد میں مسلمان نماز پڑھیں اور اس کے باہر ہندو چبوترہ پر پوجا کریں اور جھگڑا نہ ہو اور ہندوؤں نے بھی یہ تسلیم کر لیا کہ بابری مسجد مسجد ہی ہے، جہاں صرف نماز پڑھی جا سکتی ہے، پوجا نہیں ہو سکتی، پوجا اس کے باہر ہو، یہ بات بھی صحیح نہیں کہ مسجد اور چبوترہ کے بیچ میں برطانوی حکومت کے زمانہ میں سلاخیں ڈالی گئیں، قیصر التواریخ کے مصنف کا بیان ہے کہ

نواب واجد علی شاہ نے پہلی بار مسجد اور چبوترہ کے درمیان جنگلہ دے کر دونوں کی تقسیم کر دی، اس کو ۱۸۵۵ء میں بیراگیوں نے توڑ دیا، (ج ۲ص ۱۱۲) یہ اور بات ہے کہ پھر بعد میں سلاخیں ڈال دی گئی ہوں۔

الگزنڈر کننگھم کی رپورٹ جلد اول ۱۸۷۱ء: ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کی سامراجیت پورے طور پر قائم ہوگئی تو انہوں نے جہاں اپنے سامراجی مقاصد کی تکمیل کی خاطر اور بہت سے کام کئے، وہاں آثارِ قدیمہ کا محکمہ قائم کر کے ان پر کتابیں لکھوانی شروع کیں اور ہر ضلع کے گزیٹیر بھی لکھوائے، بہ ظاہر یہ بہت ہی مفید کام دکھائی دیا، مگر ان میں جو زہر بھرا گیا، ان سے لوگ بے خبر رہے، الگزنڈر کننگھم ہندوستان کے آثارِ قدیمہ کا بہت بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے، اس کی رپورٹیں آج تک تاریخی اور تحقیقی کاموں کے لئے ناگزیر ہیں، اس نے ۱۸۷۱ء میں اپنی رپورٹ کی جلد اول میں اجودھیا پر جو باب لکھا ہے، اس سے بہتر آج تک اس شہر پر کوئی اور مؤرخ و محقق نہیں لکھ سکا، ہم یہاں پر اس کے کچھ اقتباسات جستہ جستہ پیش کرتے ہیں:

"یہاں پر میں ذکر کروں کہ میں نے ایک دوسری جگہ کے بارے میں سنا ہے جو ہندوؤں کی تیرتھ گاہ ہے، یہ گومتی کے کنارے ہے، اور ست بارہ یا سبوتا دراہا (سفید سور) کے نام سے جانا جاتا ہے، یہ پندرہ کلومیٹر یا تیس میل سلطان پور سے لکھنؤ کی جانب ہے، یہاں دو سالانہ میلے لگتے ہیں، پہلا تو نویں چتر کو لگتا ہے جب چاند بڑھتا جاتا ہے، دوسرا کاتک کی پندرہویں تاریخ کو لگتا ہے، جب چاند مکمل ہو جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ یہاں پچاس ہزار آدمی جمع ہو کر اشنان کرتے ہیں، پہلا میلہ رام نومی تیرتھ کہلاتا ہے، میں ست بارہ کے نام کی اصلیت کا پتہ نہ چلا سکا"۔

اس کا ایک اقتباس یہ بھی ہے کہ بودھا یعنی گوتم بدھ نے یہاں دو جگہوں پر قیام کیا

سرسوتی میں وہ ۹ یا ۱۹ برس رہے۔

چینی سیاح ہیون سانگ کا بیان ہے کہ وہ وساکا میں چھ سال رہے، یہ سرسوتی کے جنوب میں کچھ فاصلہ پر تھا، میرے خیال میں وساکا اور ساکت دونوں ایک ہی جگہیں ہیں، اس کے بعد کننگھم اجودھیا کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

''اجودھا کا موجودہ شہر پرانے شہر کے اتر پورب میں واقع ہے، لمبائی میں دو میل ہے اور پون میل چوڑا ہے لیکن اس شہر کا آدھا حصہ بھی عمارتوں سے آباد نہیں ہے، پورے شہر پر زوال کے آثار ہیں، کھنڈروں کے اونچے اونچے ٹیلے بھی نہیں ہیں، وہاں ٹوٹی پھوٹی مورتیاں بھی نہیں ملتی ہیں، منقش ستون بھی نہیں پائے جاتے ہیں، جیسا کہ دوسرے شہروں کے ویرانوں میں پائے جاتے ہیں، کوڑے کرکٹ کے تودے ضرور ہیں جن سے اینٹیں نکال کر پڑوسی شہر فیض آباد کے مکانات بنائے گئے ہیں، یہ مسلمانوں کا شہر ڈھائی میل لمبا اور ایک میل چوڑا ہے، یہ شہر ان ملبوں سے بنا ہے جو اجودھیا میں کھود کر نکالے گئے ہیں، دونوں شہر چھ مربع میل میں واقع ہیں، یہ گویا رام کی قدیم راجدھانی اجودھیا کا نصف ہے، فیض آباد میں صرف بہو بیگم کا مقبرہ نمایاں طور سے دکھائی دیتا ہے، اس بیگم کا ذکر وارن ہیسٹنگز کے مقدمہ کے سلسلہ میں آیا، فیض آباد وہاں کے ابتدائی نوابوں کا دارالسلطنت تھا لیکن آصف الدولہ کے زمانہ میں یہ ویران ہو گیا۔''

آگے چل کر کننگھم لکھتا ہے:

''رامائن کے بیان کے مطابق اجودھیا کو 'منو' نے آباد کیا ''منو' انسان کے ابوالآباء سمجھے جاتے ہیں، رام چندر کے پتا دسرتھ کے زمانہ

میں اس میں قلعہ بند شہر تھے، پھاٹک بھی تھے اور اس کے چاروں طرف خندقیں تھیں لیکن ان کا نام ونشان بھی اب دکھائی نہیں دیتا، اس کا کوئی حصہ بھی باقی نہیں، کہا جاتا ہے کہ رام کا اجودھیا دری ہادبالا کی موت کے بعد ایک بڑی لڑائی میں ۱۳۲۶ ق م میں برباد ہوگیا، اس وقت سے یہ وکرماجیت کے زمانہ تک ویران رہا، مشہور روایت یہ ہے کہ وکرماجیت اجین کا مشہور شکاری راجہ تھا، موجودہ دور کے ہندو کرما کے سارے اعمال اسی سے منسوب کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ان کی یہ رائے مہمل ہے، ہیون سانگ کا بیان ہے کہ اس نام کا ایک طاقت ور راجہ سرسوتی کے پڑوس میں کنشک سے ایک سو سال بعد کا تھا اور تقریباً ۷۸ ق م کا زمانہ تھا اور یہی سالی واہانہ کے شروع ساکا سنگ کا زمانہ تھا، اس بکرماجیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بودھ مذہب کے پیرووں کا دشمن تھا، وہ بڑا سرگرم برہمن تھا، میری رائے ہے کہ اسی نے اجودھیا کی از سرنو تعمیر کی اور رام چندر کی تاریخ میں جو مقدس جگہ ان کے نام سے موسوم تھی، ان کو تلاش کرایا، روایۃً یہ بات کہی جاتی ہے کہ جب وہ اجودھیا آیا تو یہ بالکل کھنڈر تھا اور جنگلوں سے بھرا تھا، اس نے رام چندر کی مشہور جگہ کی کھوج لگائی، سرجوندی کے گھاٹ سے اس نے پیمائش شروع کی، بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تین سو ساٹھ مندر رام چندر، ان کی بیوی سیتا، لکشمن اور شترگھن، ہنومان اور دوسرے ناموں پر بنوائے، تین سو ساٹھ کی تعداد کا تعلق سالی واہانہ سے بھی ہے کیوں کہ راجہ کے قبیلہ کے دیس راجپوت کہتے ہیں کہ راجہ کی تین سو ساٹھ بیویاں تھیں، یعنی ہر بیوی کی خاطر اس نے ایک مندر بنوایا۔"

کچھ آگے چل کر کننگھم رقم طراز ہے:

''اجودھیا میں بہت سے برہمنوں کے مندر ہیں لیکن وہ جدید زمانہ کے ہیں، ان میں اثری خوبیاں نہیں ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ مندر زیادہ تر ان مندروں کی پرانی جگہوں پر بنائے گئے ہیں، جن کو مسلمانوں نے مسمار کروایا تھا، رام کوٹ کا ہنومان گڑھی شہر کے پورب جانب ہے، یہ چھوٹا سا قلعہ ہے، جو دیواروں سے گھرا ہے، یہ ایک جدید مندر کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے، جو ایک ٹیلہ کے اوپر ہے، رام کوٹ یقیناً بہت پرانا ہے، اس کا تعلق منی پربت سے ہے، ہنومان کا مندر زیادہ پرانا نہیں ہے، اورنگ زیب کے عہد سے پہلے کا نہیں، شہر کے پوربی کونے میں رام گھاٹ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں رام چندر نے اشنان کیا، سرگ دواری یا سورگ دوار، سورگ کا پھاٹک ہے، اتر پورب میں اس جگہ کا تعین کیا جاتا ہے، جہاں رام چندر جلائے گئے، کچھ سال پہلے یہاں برگد کا درخت تھا، جو اشوک بٹ کہلاتا تھا یعنی یہ وہ برگد ہے جس کے پاس غم نہیں پھٹکتا، شاید یہ نام سورگ وغیرہ کے تعلق سے رکھا گیا ہو، جس کے بارہ میں لوگوں کا یقین ہے کہ جو لوگ یہاں آکر مرجاتے ہیں یا جلائے جاتے ہیں، وہ دوسرے جنم سے آزاد ہوجاتے ہیں، اسی کے پاس لکشمن گھاٹ ہے، جہاں رام چندر کے بھائی لکشمن نے اشنان کیا تھا اور یہاں سے ۴/۳ میل کے فاصلہ پر شہر کے قلب میں جنم استھان کا مندر کھڑا ہے، یہاں رام چندر پیدا ہوئے، پھر پچھم کی طرف پانچ میل کی دوری پر گپتار گھاٹ ہے، یہاں کئی سفید مندر ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہیں سے لکشمن غائب ہوگئے تھے، اس لئے اس کا نام گپتار ہے،

جس کے معنی چھپا ہوا، ڈھکا ہوا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہاں سے لکشمن نہیں بلکہ رام غائب ہوئے لیکن سورگ دوارے میں ان کے جلائے جانے کے قصہ سے اس کی تطبیق نہیں ہوتی''۔

کننگھم یہ بھی لکھتا ہے کہ:

''پرانے شہر میں بودھ مت کے بیس مندر تھے، وہاں تین ہزار بھکشو رہتے تھے، اسی کے ساتھ برہمنوں کے پچاس مندر تھے اور برہمنوں کی آبادی تھی، بہت تھی، اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ساتویں صدی کے آغاز میں وکرمادتیہ کے بنائے ہوئے تین سو مندر ختم ہو چکے تھے اور اجودھیا تباہ ہو رہا تھا''۔

کننگھم کے بیان پر تبصرہ: الیگزنڈر کیننگھم کی مذکورہ بالا تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجودھیا ۱۴۲۶ ق م کے بعد بالکل تباہ ہو گیا، جنگلوں میں کھو گیا اور اس کی کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی، سارے آثار ختم ہو گئے تھے لیکن تقریباً ڈیڑھ ہزار برس بعد اس کو محض اندازے سے آباد کیا گیا اور وہاں تین سو ساٹھ مندر بنائے گئے، ان میں سے تین سو مندر مسلمانوں کی آمد سے پہلے ختم ہو گئے تھے اور جب کننگھم نے ۱۸۷۱ء میں اپنی کتاب لکھی تو اجودھیا کا یہ حال لکھا کہ ''اس شہر کا آدھا حصہ بھی عمارتوں سے آباد نہیں ہے، پورے شہر پر زوال کے آثار ہیں، کھنڈروں کے اونچے اونچے ٹیلے بھی نہیں ہیں، وہاں ٹوٹی پھوٹی مورتیاں بھی نہیں ملتیں، منقش ستون بھی نہیں پائے جاتے جیسا کہ دوسرے شہروں کے ویرانوں میں پائے جاتے ہیں''۔

یہ لکھ کر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ اس کے عہد تک ہندوؤں کی نظر میں اجودھیا کے تقدس کی کوئی اہمیت نہیں تھی، پھر وہ یہ لکھ کر بھی بودھوں کو ہندو مت سے برانگیختہ کرتا ہے کہ وکرماجیت نے محض بودھوں کو وہاں سے ختم کرنے کے لئے اس شہر کو آباد کیا، پھر یکایک وہ

مسلمانوں پر یہ الزام بھی رکھ دیتا ہے کہ اجودھیا میں جو جدید قسم کے مندر بنائے گئے ہیں، وہ زیادہ تر ان مندروں کی پرانی جگہوں پر بنائے گئے ہیں، جو مسلمانوں نے ویران کر دیے تھے، اس کے لیے کسی تاریخ کا حوالہ نہیں دیتا ہے، مگر اس کا ذکر تو مطلق نہیں کرتا کہ رام جنم استھان مندر کو توڑ کر بابر نے مسجد بنوائی جو بابری مسجد کے نام سے مشہور ہے اور امر تعجب تو یہ ہے کہ وہ یہ لکھتا ہے کہ لکشمن گھاٹ سے ۴/۱ میل کے فاصلہ پر شہر کے قلب میں جنم استھان کا مندر کھڑا ہے، اگر کننگھم کے زمانہ میں یہ مندر باقی تھا تو پھر کیسے یہ یقین کیا جائے کہ بابری مسجد اسی کو توڑ کر بنائی گئی اور ہندو اور مسلمانوں میں جو مقدمہ بازی ہوئی وہ رام جنم استھان مندر کے لیے گویا نہ تھی بلکہ ایک قضیہ قصداً کھڑا کر دیا گیا تھا، تاکہ دونوں فرقے ایک دوسرے سے الجھتے رہیں اور جب وہ یہ لکھتا ہے کہ بودھ مت کے وہاں بیس مندر تھے، جہاں تین ہزار بھکشو رہا کرتے تھے اور اب وہاں بودھوں کے کچھ بھی آثار نہیں، تو یہ الزام بھی رکھ دیتا ہے کہ وہاں سے بودھ مت کا خاتمہ کیا گیا اس طرح بودھوں کو ہندوؤں سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۸۷۷ء کا فیض آباد کا گزیٹیر: کننگھم کی تحقیقات سے انگریزوں کو بابری مسجد اور جنم استھان کے قضیہ کو آگے بڑھانے میں زیادہ مدد نہیں ملی، اس لیے ۱۸۷۷ء میں برطانوی حکومت کی نگرانی میں فیض آباد کا جو گزیٹیر لکھا گیا اس میں فتنہ کو ہوا پورے طور پر دی گئی، اس گزیٹیر کے اقتباسات یہ ہیں:

> ''زبانی طور پر بتایا جاتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کے حملہ کے وقت تین اہم مندر تھے، جن میں کچھ پجاری بھی تھے لیکن اجودھیا اس وقت ویران تھا، یہ تین مندر یہ تھے: ۱۔ رام جنم استھان، ۲۔ سورگ دوار جو رام دربار کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، ۳۔ ترتیا کا ٹھاکر، پہلے مندر پر

بابر نے مسجد بنائی اس میں تاریخ ۱۵۲۸ء لکھی ہوئی ہے، دوسرے مندر پر اورنگ زیب نے ایک مسجد اور تیسرے پر اسی بادشاہ یا اس کے کسی پیش رو نے ایک مسجد بنائی، مسلمانوں کا یہ جانا بوجھا اصول ہے کہ جب وہ کسی قوم کو مغلوب کرتے ہیں تو اس پر اپنا مذہب نافذ کرتے ہیں، جنم استھان وہ جگہ ہے جہاں رام چندر پیدا ہوئے اور سورگ دوار وہ جگہ ہے جہاں سے رام چندر بیکنٹھ گئے، ممکن ہے یہ وہ جگہ بھی رہی ہو جہاں وہ جلائے گئے، ترتیا کا ٹھاکر وہ جگہ ہے جہاں رام چندر نے بڑی بھینٹ چڑھائی، اپنی اور سیتا کی مورتیاں بھی بٹھائیں، لیڈن کی تزک بابری کے مطابق بابر نے ۲۸ / مارچ ۱۵۲۸ء کو سرجو اور گھاگھرا کے سنگم پر اپنے لشکر کا پڑاؤ ڈالا، جو اجودھیا سے تین چار کوس کے فاصلہ پر تھا، یہاں وہ سات آٹھ دن ٹھہرا، آس پاس کے علاقہ کو قابو میں کرتا رہا، سرجو کے ساحل پر ایک شکارگاہ تھی جو اودھ سے سات آٹھ کوس کے فاصلہ پر تھی، یہ بات توجہ کے لائق ہے کہ بابر کی تزک کے تمام نسخوں کے وہ صفحے نہیں ہیں جن میں اجودھیا میں رہ کر اس نے جو کچھ کیا، اس کا ذکر ہو، بابر کی مسجد ۹۳۵ھ / ۱۵۲۸ء میں بنی، اس میں ایک منقش پتھر ہے جس پر ایک کتبہ ہے، اس میں بابر کی شان و شوکت کا اظہار کیا گیا ہے، اگرچہ اجودھیا اس وقت ویران ہو چکا تھا، مگر وہاں کم از کم جنم استھان کا عمدہ مندر ضرور رہا ہوگا، کیوں کہ وہاں اب بھی کچھ ستون ہیں اور اچھی حالت میں ہیں، ان کو مسلمانوں نے بابری مسجد کی تعمیر میں ضرور استعمال کیا، وہاں گہرے کالے رنگ کے پتھر ہیں جن کو وہاں کے لوگ کسوٹی کہتے ہیں، ان پر طرح طرح کے نقش بنے ہوئے

ہیں لیکن میرے خیال میں یہ بودھوں کے ستون سے زیادہ ملتے جلتے ہیں اور ان سے مختلف ہیں جن کو میں نے بنارس یا دوسری جگہوں میں دیکھا ہے، وہ سات یا آٹھ فٹ لمبا ہے، نیچے چوکور ہے، بیچ اور کیپٹل میں یا تو گول یا ہشت پہل بنا ہوا ہے۔

جنم استھان ہنومان گڑھی سے کئی سو قدم کے فاصلہ پر ہے، ۱۸۵۵ء میں ہندو مسلمان دونوں کے درمیان ایک سخت جھگڑا ہوا، ہندوؤں نے زبردستی ہنومان گڑھی پر قبضہ کرلیا لیکن مسلمانوں نے اس کے بدلے جنم استھان پر قبضہ کرلیا، مسلمان اس موقع پر ہنومان گڑھی کے زینہ تک پہنچ گئے، پھر وہ کافی نقصان کے بعد پیچھے ڈھکیل دیے گئے، ہندوؤں نے ان کا پیچھا کامیابی کے ساتھ کیا اور انہوں نے جنم استھان پر قبضہ کرلیا، اس سلسلہ میں پچھتر مسلمان ہلاک ہوئے اور وہ گنج شہیداں میں دفن کئے گئے، گیارہ ہندو بھی مارے گئے، بادشاہ کی فوج یہ سب کچھ دیکھتی رہی، مگر اس کو حکم تھا کہ وہ اس جھگڑے میں مداخلت نہ کرے، یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک ہندوؤں اور مسلمان دونوں اس مسجد و مندر میں عبادت اور پوجا کیا کرتے تھے، برطانوی حکومت کے زمانہ میں بیچ میں سلاخیں ڈال دی گئیں، تاکہ حد بندی کرکے جھگڑا روک دیا جائے، مسجد میں مسلمان نماز پڑھیں اور سلاخوں کے باہر ہندوؤں نے جو چبوترہ بنالیا ہے اس پر وہ پوجا کیا کریں، اسی کے کچھ دنوں کے بعد امیٹھی کے مولوی امیر علی نے ہنومان گڑھی کی ایک پرانی مسجد پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، دو اور مسجدوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، عام لوگ یہ جانتے ہیں کہ یہ نورنگ شاہ کی بنائی

ہوئی ہیں، نورنگ شاہ سے مراد اورنگ زیب ہے لیکن یہ دونوں مسجدیں خوب صورت کھنڈر ہیں، رام دربار کے مندر کی بازیابی کے لئے ہندوؤں نے کچھ نہیں کیا، ترتیا کا ٹھاکر کا جو پرانا کھنڈر تھا، اس کو کالپی کے راجہ نے پھر سے بنوایا، اس راجہ کی ریاست دوصدی پہلے پنجاب میں تھی، اس میں کچھ مزید اضافہ مرہٹہ کی رانی اہلیہ بائی نے کیا، اس نے اس کے متصل ایک گھاٹ بھی بنایا، وہ جسونت راؤ ہولکر کی بیوی تھی، اس خاندان کی طرف سے دوسو اکیس روپئے کی سالانہ رقم مقرر ہوئی جو اب تک جاری ہے۔

تبصرہ: اس گزیٹر میں وہی باتیں زیادہ تر دہرائی گئی ہیں جو کارنیگی کی رپورٹ میں تھیں، مگر مرتب نے اپنی طرف سے پورے وثوق کے ساتھ یہ اضافہ بھی کر دیا ہے کہ:

''پہلے مندر (یعنی رام جنم استھان) پر بابر نے مسجد بنائی، اس میں تاریخ ۱۵۲۸ء لکھی ہوئی ہے، دوسرے مندر (یعنی سورگ دوار) پر اورنگ زیب نے ایک مسجد اور تیسرے (یعنی ترتیا کا ٹھاکر) پر اسی بادشاہ یا اس کے کسی پیش رو نے ایک مسجد بنائی۔''

ایسے اہم بیانات کے لئے کسی مستند اور معاصر تاریخوں کا حوالہ دینا چاہئے تھا، تب ہی ایک مؤرخ کے نزدیک قابل ہو سکتے ہیں، زبانی روایت کی سند کوئی سند نہیں ہوتی ہے، کارنیگی کی تحریر میں ایسی باتیں یقین کے ساتھ نہیں کہی گئی تھیں، کننگھم کے یہاں بھی یہ صراحت نہیں ہے لیکن گزیٹر کے مرتب کو فتنہ کی پرورش کرنی تھی، اس لیے یہ سب کچھ لکھ گیا اور اپنے جھوٹے دعویٰ کو اس جھوٹی تاویل سے مستحکم بنانے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کا تو یہ جانا بوجھا اصول ہے کہ جب وہ کسی قوم کو مغلوب کرتے ہیں تو اس پر اپنا مذہب نافذ کرتے ہیں، ایسے بیان کو صرف شرانگیزی ہی کہہ کر نظر انداز کیا جاسکتا ہے، گزیٹر کے مرتب کو

حساس تھا کہ جب تک رام جنم استھان کے مندر کے مسمار کرنے کا ثبوت مستند تاریخ سے
یش نہیں کیا جائے گا وہ قابل قبول نہیں ہوگا، اس لیے اس نے کارنیگی ہی کے اس بیان کو
ہرادیا ہے کہ تزک بابری کے وہ اوراق ہی گم ہیں جن میں بابر کے اجودھیا میں آنے کا ذکر
اہوگا، پھر وہ اپنے بیان کو یہ لکھ کر خود مشکوک کر دیتا ہے کہ اگر چہ اجودھیا اس وقت (یعنی
برکے زمانے میں) ویران ہو چکا تھا، مگر کم از کم رام جنم استھان کا عمدہ مندر ضرور رہا ہوگا،
یوں کہ وہاں اب بھی کچھ ستون ہیں اور اچھی حالت میں ہیں ''کم از کم'' اور ''رہا ہوگا'' سے
اہر ہے کہ مرتب جو کچھ لکھ رہا ہے، اس پر خود اس کو یقین نہیں لیکن وہ شر پیدا کرنا چاہتا تھا،
ن لیے یہ سب کچھ لکھ گیا ''کم از کم'' سے یہ تعبیر کی جاسکتی ہے کہ وہاں صرف رام جنم استھان
ن تھا، پھر یہ الزام کیسے عائد کر دیا گیا ہے کہ ایک پر (یعنی سورگ دوار پر) اورنگ زیب اور
وسری (یعنی ترتیا کا ٹھاکر) پر اس کے کسی پیش رو نے مسجد بنادی اور جب پیش رو کا نام
علوم نہ تھا تو پیش رو لکھ کر صرف ہندوؤں کو برانگیختہ ہی کرنا تھا، گزیٹیر کے مرتب نے یہ بھی
لکھا ہے کہ رام جنم استھان کے مندر کے کچھ ستون بابری مسجد میں ضرور لگائے گئے، مگر اس
کے اس بیان سے اس کی تردید ہو جاتی ہے کہ میرے خیال میں یہ بودھوں کے ستون سے
زیادہ ملتے جلتے ہیں، یعنی یہ ستون رام جنم استھان مندر کے نہیں ہیں، بلکہ بودھ مت کے کسی
مندر کے ہیں، ایسا ہونا ممکن ہے، بودھوں کے وہاں بہت سے مندر تھے، خانقاہیں بھی تھیں،
جن کو برہمنوں نے ختم کیا، وہاں ان کے مندروں کے کچھ ستون پڑے ہوں جن کو بابری
مسجد میں لگا دیا گیا ہو، اس گزیٹیر میں ۱۸۵۵ء میں ہندو مسلمان کے خوں ریز تصادم کا ذکر
ہے، مگر اس کے مرتب نے کارنیگی ہی کی طرح اس کے اسباب کا ذکر تفصیل سے نہیں کیا ہے
اور انگریزوں نے اس میں جو وحشیانہ کردار ادا کیا ہے اس کو بھی کارنیگی ہی کی طرح صرف
نظر کر کے ان کے ظلم اور سفا کی پر پردہ ڈال دیا گیا ہے، ۱۸۵۵ء کے بلوے کے ذکر میں اس

گزیٹیر کے مرتب نے کچھ ایسا انداز بیان اختیار کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بلوہ مرتبہ مختلف زمانوں میں ہوا، حالاں کہ گذشتہ اوراق میں یہ ذکر آیا ہے کہ ہنومان گڑھی کی مسجد کی بازیابی کے لیے پہلے شاہ غلام حسین بڑھے، ان کے ہمراہیوں کا قتل عام ہوا تو پھر مولوی امیر علی امیٹھوی اٹھے، دونوں کی مہم گویا ایک تھی، اس سلسلہ میں مرتب بابری مسجد کو جنم استھان ہی کہہ کر ہندوؤں کو خوش کرتا ہے، پھر مرتب کے بیان کے مطابق ۱۸۵۵ء ہی کے بلوے کے موقع پر مسجد اور چبوترہ کے بیچ میں سلاخیں ڈال کر دونوں کی علاحدہ علاحدہ تقسیم کردی گئی، یہ بھی صحیح نہیں، پہلے توجہ دلائی گئی ہے، اس کی تقسیم نواب واجد علی شاہ ہی کے زمانہ میں ہوگئی تھی، اس گزیٹیر کے مرتب نے کارنیگی ہی کے اس بیان کو دہرادیا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک ہندو اور مسلمان دونوں اس مسجد مندر میں عبادت اور پوجا کیا کرتے تھے، پہلے بھی ذکر آیا ہے کہ یہ بیان قابل قبول نہیں، صرف ہندو مسلمان میں فتنہ پیدا کرنے کی غرض سے لکھا گیا ہے، اکبر کی رواداری اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی، اس کے عہد میں بھی کوئی ایسی عبادت گاہ نہیں بنی جس میں مورتی کی بھی پوجا ہو اور نمازیں بھی پڑھی جائیں۔

آخر میں مرتب نے ہنومان گڑھی کے خلاف مولوی امیر علی کی مہم کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "دو اور مسجدوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، عام لوگ یہ جانتے ہیں کہ یہ نورنگ شاہ کی بنائی ہوئی ہیں، نورنگ شاہ سے مراد اورنگ زیب ہے لیکن یہ دونوں مسجدیں خوبصورت کھنڈر ہیں"، مرتب نے ان دو مسجدوں کے نام نہیں لکھے ہیں، لیکن اگر مرتب کے بیان کو یقین کرلیا جائے تو اورنگ زیب نے ایک تو سورگ دوار کے مندر کو توڑ کر وہاں مسجد بنائی، پھر دو اور مسجدیں بنوائیں جن کا وہ نام نہیں لیتا ہے، اس طرح وہ تین مندروں کے انہدام کا الزام رکھتا ہے لیکن آخری دو مسجدوں کا ذکر کرکے خوش ہے کہ یہ خوبصورت کھنڈر ہیں، جس سے یہ ظاہر ہے کہ ہندوؤں نے ان کو مسمار کردیا، مولوی امیر علی کی جنگی مہم تو ان ہی

مسجدوں کے انہدام کے خلاف احتجاجاً تھی، مرتب کو دکھ تھا کہ رام دربار کے مندر کی بازیابی کے لیے ہندوؤں نے کچھ نہیں کیا، مگر حدیقۂ شہداء کے مصنف کے بیان کے مطابق رام دربار کی مسجد ۱۸۵۵ء سے پہلے ہی شہید کردی گئی تھی (ص ۵) مرتب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ترتیا کا ٹھاکر کا جو پرانا کھنڈر تھا، اس کو کالپی کے راجہ نے پھر سے بنوایا، اس راجہ کی ریاست دو صدی پہلے پنجاب میں تھی، مرتب نے پہلے لکھا ہے کہ ترتیا کا ٹھاکر کے مندر پر اورنگ زیب کے کسی پیش رو نے مسجد بنائی تھی، مرتب کے بیان سے یہ واضح نہیں کہ اورنگ زیب کے پیش رو نے جو مسجد بنائی تھی اس کو مسمار کرنے کے بعد جو یہ کھنڈر بن گیا تھا اس پر کالپی کے راجہ نے کوئی مندر بنایا، یا پہلے ہی سے یہ کھنڈر تھا، اس پر اس نے ایک مندر بنایا، اگر یہ پہلے ہی کھنڈر بن گیا تھا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ہندو اس کی مذہبی اہمیت کے قائل نہ تھے، مرتب نے اورنگ زیب پر اجودھیا کے مندروں کے انہدام کا الزام اپنی سیاسی مصلحتوں کی خاطر زیادہ سے زیادہ رکھنے کی کوشش کی تھی مگر اس کی تصدیق جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا ہے، اورنگ زیب کے عہد کی معاصر تاریخوں سے نہیں ہوتی ہے اور نہ اورنگ زیب کے سب سے بڑے معاند اور ناقد مؤرخ سر جدوناتھ سرکار نے اس کا ذکر کیا ہے کہ اس نے اجودھیا کے مندروں کو بھی مسمار کیا۔

۱۸۸۱ء کا امپیریل گزیٹیر: ۱۸۸۱ء میں انڈیا کا امپیریل گزیٹیر ڈبلو، ڈبلو ہنٹر نے مرتب کیا تو اس نے اجودھیا کا ذکر اس طرح کیا:

> ''یہ فیض آباد ضلع یعنی اودھ کا ایک قدیم شہر ہے، فیض آباد سے متصل ہے، گھاگھرا دریا کے دائیں یعنی جنوبی ساحل پر واقع ہے، اس کا عرض البلد ۲۶ـ۴۸ـ۲۰ اور طول البلد ۸۲ـ۱۴ـ۴۰ ہے، اجودھیا سے دلچسپی اس کی قدیم تاریخ کی وجہ سے ہے، موجودہ دور میں پرانا شہر بالکل

غائب ہو چکا ہے اور یہ کھنڈروں کا ڈھیر ہے اور جنگلوں میں گم ہو گیا ہے، لیکن قدیم زمانہ میں اجودھیا ہندوستان کے عظیم ترین اور شاندار ترین شہروں میں سمجھا جاتا تھا، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا رقبہ ۹۶ میل تک پھیلا ہوا تھا اور کوشل کی سلطنت کا دارالسلطنت تھا اور اس میں موجودہ دور کا اودھ بھی شامل تھا اور یہاں سورج بنسی خاندان کے راجہ دسرتھ کا دربار تھا، راماین کے ابتدائی ابواب کے مطالعہ سے اس شہر کی شوکت اور یہاں کے فرماں روا کی شان اور یہاں کے لوگوں کی نیکی، دولت اور اطاعت گذاری کا اندازہ ہوتا ہے، دسرتھ رام چندر کے باپ تھے، جو راماین کی رزمیہ شاعری کے ہیرو ہیں، جب اس سورج بنسی خاندان کے آخری فرماں روا کی موت ہوئی تو یہاں بودھوں کا تسلط قائم ہو گیا، برہمنوں کے قصہ کے مطابق اجودھیا زوال پذیر ہو گیا لیکن جب برہمنیت کا عروج راجہ بکرماجیت کے زمانہ یعنی ۵۷ ق م میں ہوا تو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے اس قدیم شہر کی کھوج لگائی اور اس نے مختلف مندروں اور جگہوں کی نشان دہی کی، جو رام کی زندگی سے منسوب تھیں، ان میں سب سے اہم مقام رام کوٹ تھا، جو بادشاہ کا قلعہ اور محل تھا، پھر ناگیشور ناتھ مندر کی کھوج بھی لگائی گئی، جو مہادیو کے نام پر تھا، مانی پربت پہاڑی کی بھی تلاش کی گئی اور اسی طرح اور مندروں کا بھی پتہ لگایا گیا جہاں اب ہزاروں لوگ پہنچا کرتے ہیں، بکرماجیت کے بعد کوشل سلطنت پایۂ تخت اجودھیا کے ساتھ سمدرپال سری باستم اور قنوج کے خاندانوں کے ساتھ ہو گیا، یہاں تک کہ مسلمان فاتحوں کے زیر نگین

ہوگیا، کوشل اس لیے بھی مشہور رہا کہ بودھ مت کا بہت بڑا مرکز رہا، جین فرقہ کے لوگ بھی یہاں رہے اور ان دونوں مذہبی فرقوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے مذہب کے بانیوں کی جنم بھومی ہے، ہیون سانگ ساتویں صدی میں یہاں آیا اور اس نے یہاں بودھوں کی بیس عبادت گاہیں دیکھیں، جن میں تین ہزار بھکشو اجودھیا میں رہتے تھے، برہمنوں کی بھی یہاں آبادی تھی، یہاں جینیوں کے بھی مندر ہیں لیکن وہ حال کے بنے ہوئے ہیں، بعض مندر ڈیڑھ سو سال پہلے کے بنے ہوئے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ جینیوں کے پانچ مذہبی پیشواؤں کی پیدائش کی جگہ ہے، مسلمانوں کی فتح کی یادگار میں ان تین مسجدوں کے کھنڈر باقی ہیں، جو بابر اور اورنگ زیب نے ان جگہوں پر یا ان کے نزدیک بنوائیں جو ہندوؤں کے تین مشہور مقدس مقامات ہیں، ۱۔ جنم استھان، یعنی وہ جگہ جہاں رام چندر پیدا ہوئے ۲۔ سورگ دوار مندر، یعنی وہ جگہ جہاں رام چندر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جلائے گئے، ۳۔ ترتیا کا ٹھاکر، جو اس لیے مشہور تھا کہ یہاں بڑی بڑی قربانیاں ہوتی تھیں، اجودھیا میں اس وقت ایک ہزار چھ سو ترانوے گھر ہیں، سات ہزار پانچ سو اٹھارہ کی آبادی ہے، جن میں چار ہزار چار سو ساٹھ ہندو ہیں اور دو ہزار پانچ سو انیس مسلمان ہیں، پانچ سو بانوے بقیہ اور لوگ ہیں، چھیانوے ہندو مندر ہیں جن میں تریسٹھ وشنو اور تینتیس شیو جی کے ہیں، چھتیس مسلمانوں کی مسجدیں ہیں، درشن سنگھ یا مان سنگھ کا مندر اب سے پچیس برس پہلے بنایا گیا تھا اور بہو بیگم کا مقبرہ بہترین عمارتوں میں شمار کیا جاتا ہے، اس کو شاہ اودھ نے بنایا، یہاں

تجارت بہت تھوڑی مقامی طور پر ہوتی ہے، البتہ رام نومی میلہ بہت بڑا ہوتا ہے، جس میں پانچ لاکھ ہندو شریک ہوتے ہیں"۔

تبصرہ: ڈبلو، ڈبلو، ہنٹر نے بعض باتیں وہی لکھی ہیں جو کارنیگی نے ۱۸۷۰ء اور کننگھم نے ۱۸۷۱ء اور ۱۸۷۷ء کے فیض آباد گزیٹیر کے مرتب نے لکھی تھیں لیکن اس میں جب یہ لکھا گیا کہ بابری مسجد کھنڈر میں تبدیل ہوگئی تو یہ کیسے یقین کیا جاسکتا ہے جب کہ وہ مسجد اسی طرح قائم ہے اور اسی کے لیے سارا جھگڑا ہے لیکن اس کے اس بیان کے اس ٹکڑے پر غور کیا جاسکتا ہے کہ "بابر اور اورنگ زیب کی مسجدیں ہندوؤں کے مندروں کے نزدیک بنیں"۔ صحیح تو یہی ہے کہ مسجدیں ان مندروں کے نزدیک بنیں، مگر انگریزوں نے ہندوؤں کو برانگیختہ کرنے اور اکسانے کے لیے یہ لکھنا شروع کیا کہ یہ مندروں کی جگہوں پر بنیں، اس گزیٹیر سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ۱۸۸۱ء تک بودھوں کے سارے آثار اجودھیا سے ختم کردیے گئے تھے۔

۱۸۸۳ء کا مقدمہ: ۱۸۸۳ء میں ہندو مسلمانوں میں مسجد کی سفیدی کے سلسلہ میں پھر مقدمہ بازی شروع ہوئی جس کی تفصیل حسب ذیل مقدمہ سے معلوم ہوگی:

نقل احکام ۲۸ر نومبر ۱۸۸۳ء مرسل نمبر ۱۹۳۳۵

محلہ کوٹ رام چندر اجودھیا

سید محمد اصغر خطیب بنام رگھوبیر داس مورخہ ۲۲ر جنوری ۱۸۸۴ء

اجلاس

حکم ہوا کہ مرزا محمود بیگ صاحب کے پاس بھیج کر لکھا جاوے کہ بعد تحقیقات کے رپورٹ کریں کہ منجانب سائل کس کس طرف سفیدی ہوئی ہے اور منجانب ہندوؤں کے کس کس طرف قیاس کیا جاتا ہے کہ پچھم طرف کے ٹکڑوں پر مسلمانوں کی طرف سے اور پورب

کی طرف کے ٹکڑوں پر ہندوؤں کی طرف سے سفیدی ہو رہی ہے۔

رپورٹ بھیجئے اندر دو ہفتہ کے ....

۲۸؍نومبر ۱۸۸۳ء مقام جلال آباد..

تبصرہ: اس درخواست سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے مسجد کی سفیدی کے سلسلہ میں چھیڑ چھاڑ کی خاطر ایک تنازعہ کھڑا کر دیا گیا۔

۱۸۸۳ء کے مقدمہ کے ایک حکم نامہ کی نقل: نقل حکم نامہ تعمیلیہ حکم..........

محمد اصغر ور گھوبیر میں تعمیل ہوا۔

مورخہ ۵؍دسمبر ۱۸۸۳ء...... مجریہ نمبر ۱۹۳۳۵

محلہ کوٹ اجودھیا سید محمد اصغر خطیب مدعی بنام رگھوبیر داس

مورخہ ۲۲؍جنوری ۱۸۸۴ء اجلاس

بہ حکم محمود ملک صاحب اسسٹنٹ کمشنر بہادر

سید محمد اصغر خطیب و موذن مسجد بابری مدعی

بنام مہنت رگھوبیر داس مہنت چبوترہ جنم استھان مدعاعلیہ

حکم نامہ بنام

در حکم اطلاع نامہ x سید محمد اصغر خطیب و موذن مسجد بابری و مہنت رگھوبیر داس مہنت استھان تم کو دیگر حکم ہوتا ہے کہ ہر دو فریق کو دے کر اور دستخط ان کے حکم نامہ...... لکھا کر رپورٹ تعمیلی پیش کرو، تاکید جانو۔

المرقوم ۵؍دسمبر ۱۸۸۳ء

تبصرہ: اسسٹنٹ کمشنر کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ فریقین کوئی مزید کارروائی نہ کریں جب تک اس کے متعلق باضابطہ رپورٹ نہ آجائے۔

۱۸۸۴ء کا مقدمہ: ۱۸۸۴ء میں بھی ہندو مسلمانوں میں کچھ تنازعہ پیدا ہوا جس کی تفصیل حسب ذیل درخواست کی نقل سے معلوم ہوگی۔

سید محمد اصغر......۲/نومبر ۱۸۸۴ء...... منعقدہ ۲۲/جنوری ۱۸۸۴ء

سید محمد اصغر خطیب ومتولی جامع مسجد بابری واقع اودھ

بنام

رگھوبیر داس مہنت چبوترہ جنم استھان ساکن اودھ

غریب پرور! سلامت تصریح دعویٰ:

حال شرارت مدعیٰ علیہ کہاں تک عرض کروں کہ طویل ہے، مختصر یہ ہے کہ دیوار احاطہ مسجد بابری کے اندر چبوترہ جنم استھان مدعیٰ علیہ کا ہے، مدعیٰ علیہ کو سوائے چبوترہ کے دیوار احاطہ بیرونی سے یا گھیرہ سے یا پھاٹک سے کوئی واسطہ نہیں ہے، کل متعلق مسجد ممدوحہ سے ہے وعلامت ونشانات اس کی مسجد کی ہیں بلکہ اوپر دروازہ کے جو دیوار بیرونی کا ہے، اس پر اللہ مرقوم ہے، مطابق اس کے قبض وتصرف سائل میں چلا آتا ہے، جب ضرورت مرمت وغیرہ کی ہوتی ہے، سائل نے مرمت کروائی......ہے، بلکہ عرصہ تین سال کا ہو چکا ہے کہ دیوار پھاٹک کی گر گئی تھی، مرمت ہوئی اور خرچ کر کے مرمت کرایا ہے، و ہمیشہ سے سفیدی ہمراہ مسجد کے دیوار و پھاٹک کے ہر سال کرتا رہا ہے، جیسا کہ امسال بھی حسب معمول سامان سفیدی کا کیا، مگر مدعا علیہ سفیدی دیوار پھاٹک پر کرنے کے ہارج ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم سفیدی کریں گے......سفیدی مسجد کی ملتوی ہے، تھانہ اطلاع کیا، افسر نے فہمایش کی کہ تین جگہ پر کرو، باوجودے کہ مدعیٰ علیہ کی جگہ سوائے چبوترہ یا رسوئیں دوسری نہیں ہے، دیوار پھاٹک ہمراہ مسجد کے تعمیر ہوا ہے، مدعا علیہ سے واسطہ نہیں ہے، فہمایش پر نظر نہیں ہے، بلکہ موجودہ مدعا علیہ ہمہ وقت آمادہ فوجداری کے رہتا ہے، جب جب مدعا علیہ نے کچھ کچھ

تی کی ہے تب تب عدالت سے باز رکھا گیا ہے، مکان مدعیٰ علیہ...... حضور میں گذار کر

ردار ہوں۔

بہ تحقیقات مندرجہ بالا و ملاحظہ حسب دیوار وعمارت مسجد مدعیٰ علیہ کو باز رکھا

ئے کہ سائل سفیدی دیوار و پھاٹک پر کرے، واجب عرض کیا۔

مورخہ ۲ر نومبر ۱۸۸۴ء فدوی محمد اصغر متولی وخطیب مسجد بابری واقع اودھ

مرہ: نومبر ۱۸۸۳ء کی درخواست سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے قریب احاطہ میں ایک

بترہ بن گیا گو کہ پہلی درخواست میں یہ صراحت موجود تھی کہ صدیوں سے زمین خالی پڑی

ی اسی درخواست سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ باہری دیوار، گھرے اور پھاٹک سے مدعیٰ

یہ کو کوئی واسطہ نہیں، یہ ساری چیزیں مسجد کی ہیں کیوں کہ تمام علامات ونشانات مسجد کے ہیں

ہاں تک کہ دروازہ کے اوپر لفظ اللہ مرقوم ہے، مسجد کے متولی ہمیشہ سے مسجد کے ساتھ دیوار

ر پھاٹک کی سفیدی کراتے رہے ہیں لیکن اس سال سفیدی کا سامان منگانے کے بعد مدعیٰ

لیہ نے مزاحمت کی۔

۱۸۸۵ء کے مقدمہ کی تفصیل: اس کے بعد اجودھیا کے مہنتوں نے ۱۸۸۵ء

میں ایک مقدمہ دائر کیا، اس میں مہنت رگھوبیر داس مہنت استھان واقع اجودھیا نے اس

زمانہ کے سکریٹری آف اسٹیٹ کو مدعیٰ علیہ بنا کر یہ درخواست دی:

''مہنت رگھوبیر داس مہنت استھان واقع ایودھی مدعی بنام کونسل میں ہندوستان

کے سکریٹری آف اسٹیٹ مدعیٰ علیہ مذکورہ صدر مدعی نے ریاست کے سامنے درج

درخواست کی، اجودھیا میں واقع چبوترہ جنم استھان پر مندر کی تعمیر کے لئے مدعیٰ علیہ کی طرف

سے ممانعت کے مقابلہ میں مدعی کو تفویض اجازت سے متعلق مقدمہ (چبوترہ کا سائز) شمال

میں ۱۷ رفٹ، مشرق میں ۲۱ رفٹ ہے، بازار کے دام کے مطابق اس کی کوئی قیمت نہیں لگائی

جاسکتی، لہذا مدعی کے بیان کے مطابق جیسا کہ ایکٹ ۱۸۵ کے قانون کلاز ۱۱ دفعہ ۱۷ میں گیا ہے، کورٹ فیس بقدر ....روپے دے دی گئی ہے، جائے وقوع کی پوری وضاحت منسلک نقشہ سے ہوسکتی ہے۔

(۱) شہر فیض آباد میں اجودھیا کے مقام پر واقع جنم استھان ہندوؤں کی ایک پرانی اور مقدس عبادت گاہ ہے اور مدعی (۱) عبادت گاہ کا مہنت ہے۔

(۲) جنم استھان کا چبوترہ مشرقی اور مغربی جانب سے اکیس فٹ لمبا اور شمالی اور جنوبی جانب سے سترہ فٹ ہے، وہیں پر ''چرن پنیہ'' بھی ہے اور اس پر ایک چھوٹا مندر بھی ہے جس کی پوجا کی جاتی ہے۔

(۳) مذکورہ چبوترہ مدعی کے قبضہ میں ہے اور چوں کہ اس چبوترے پر کوئی عمارت بنی ہوئی نہیں ہے اس لیے مدعی اور دوسرے کو موسم گرما میں شدید گرمی، جاڑے میں شدید سردی اور برسات میں بارش کی وجہ سے سخت پریشانیوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اگر چبوترے کے اوپر مندر بنا دیا جائے تو اس سے کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوگا، بلکہ مندر کی تعمیر سے مدعی اور دوسرے فقیروں اور یاتریوں کو ہر طرح کی سہولت حاصل ہوگی۔

(۴) فیض آباد کے ڈپٹی کمشنر نے مارچ یا اپریل ۱۸۸۳ء میں کچھ مسلمانوں کی طرف سے اعتراض کی بنا پر مندر کی تعمیر پر ممانعت عائد کردی تھی، جس پر اس درخواست گذار نے مقامی بلدیہ کے سامنے ایک پٹیشن داخل کی لیکن جب اس کا کوئی جواب نہ ملا تو مدعی نے ۱۸ راگست ۱۸۸۴ء کو سی پی سی کی دفعہ ۴۱۴ کے تحت لوکل گورنمنٹ کے سکریٹری کے آفس کو ایک نوٹس بھیجا، لیکن اس کا بھی کوئی جواب موصول نہیں ہوا، لہذا اس مقدمہ کے لیے قانونی چارہ جوئی کا سبب اجودھیا میں حکم امتناعی کی تاریخ سے ہی پیدا ہوگیا ہے، جو کہ اس عدالت کے اختیار سماعت کی مقامی حد کے اندر ہے۔

(۵) ایک عام آدمی جو ریاست کا خیر خواہ ہے اسے اس زمین پر جو اس کی ملکیت اور تصرف میں ہے اپنی پسند کی کسی بھی طرح کی عمارت بنانے کا حق حاصل ہے اور حکومت جو کہ جائز اور برحق ہے بروئے ذمہ داری اپنی رعیت کے تحفظ کی، اپنے حقوق کے حصول میں ان کی مدد کرنے کی اور نظم وقانون کی برقراری کے لیے ضروری احتیاطی اقدامات کرنے کی پابند ہے، لہٰذا یہ درخواست کی جاتی ہے کہ اجودھیا میں واقع چبوترہ جنم استھان کے اوپر جس کی اراضی شمال میں ۱۷ رفٹ مشرق میں ۲۱ رفٹ جنوب میں ۱۷ رفٹ، مغرب میں ۲۱ ر فٹ ہے، ایک مندر کی تعمیر کی اجازت اور مندر کی تعمیر سے مدعی کو روکنے یا اس میں رکاوٹ ڈالنے کے خلاف مدعا علیہ کو باز رہنے کی تاکید پر مشتمل ایک حکم جاری کیا جائے، اس مقدمہ کی لاگت مدعیٰ علیہ فریقوں پر عائد کی جائے۔

میں رگھوبیر داس مہنت جنم استھان اجودھیا بہ حیثیت مدعی اعلان کرتا ہوں کہ اس دعویٰ میں شامل کیے گئے جملہ مندرجات میرے ذاتی علم اور یقین کی حد تک درست ہیں۔

دستخط مہنت رگھوبیر داس تاریخ ۲۹ رجنوری ۱۸۸۵ء (بہ شکریہ مسلم انڈیا اردو، مئی ۱۹۸۶ء)

تبصرہ: اس درخواست میں اس بات کی التجا نہیں کی گئی ہے کہ بابری مسجد جس جگہ توڑ کر بنائی گئی ہے، وہ جگہ دلائی جائے، اس سے ظاہر ہے کہ یہ بات ثابت نہیں ہو سکی کہ یہ مسجد کسی مندر کی جگہ پر بنائی گئی ہے، بلکہ درخواست یہ ہے کہ چبوترہ پر کوئی عمارت بنی ہوئی نہیں ہے، اس لیے مدعی اور دوسروں کو موسم گرما میں شدید گرمی اور جاڑے میں شدید سردی اور برسات میں بارش کی وجہ سے پریشانیوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس لیے چبوترے کے اوپر مندر بنانے کی اجازت دی جائے، اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ۱۸۸۵ء کے ہندوؤں نے یہ تسلیم کرلیا کہ بابری مسجد رام جنم بھومی کو توڑ کر نہیں بنائی گئی، اس کی وضاحت اسی مقدمہ کے فیصلہ سے بھی ہو جائے گی، اس زمانہ میں اتفاق سے فیض آباد عدالت کے سب جج

پنڈت ہری کشن تھے، ان کا جو فیصلہ ہوا تو اس سے ان پر کوئی یہ الزام نہیں رکھ سکتا ہے کہ ہندوؤں پر ظلم کرنے کی خاطر، بے انصافی سے کام لے کر یہ فیصلہ دیا، ہم اس فیصلہ کی پوری نقل یہاں پر پیش کرتے ہیں، اس میں کچھ قانون کی وضاحت بھی ہے، جو ہماری اس تحریر کے لیے ضروری نہیں ہے، مگر ہم اس لیے نقل کردیتے ہیں کہ یہ پورا فیصلہ اس کتاب میں محفوظ ہو جائے۔

فیض آباد کے سب جج پنڈت ہری کشن کا فیصلہ:

نقل فیصلہ پنڈت ہری کشن سب جج فیض آباد۔ مورخہ ۲۴؍دسمبر ۱۸۸۵ء

فیصلہ بابت اجازت تعمیر مندر

یہ مقدمہ آج مدعی اور اس کے وکیل مختار کوکل وکیل اور سرکاری وکیل پنڈت بشمبھر ناتھ اور محمد اصغر مدعیٰ علیہ اور اُس کے وکیل مختار کی موجودگی میں پیش کیا گیا، ریکارڈ میں شامل جملہ کاغذات کے معاینہ میں یہ ثابت ہے کہ مدعی جنم استھان (جائے پیدائش) کا مہنت ہے، اس تعلق سے ایک مقدمہ سکریٹری آف اسٹیٹ کے خلاف پیش کیا گیا تھا جس کے بعد محمد اصغر اپنی درخواست کے مطابق اس مقدمہ کا مدعیٰ علیہ قرار پایا، مدعی کا کیس بالاختصار درج ذیل ہے:

''چبوترہ (پلیٹ فارم) جنم استھان، مشرق و مغرب ۲۱ فٹ، شمال و جنوب ۱۷ فٹ پر مدعی کا قبضہ ہے اور چوں کہ چبوترے کے اوپر کوئی عمارت نہیں ہے، اس لیے مدعی اور دوسرے فقیروں کو ہر موسم میں گرمی میں انتہائی گرمی کی وجہ سے، جاڑے میں شدید ٹھنڈک کی وجہ سے اور برسات میں بارش کی وجہ سے سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اگر ایک مندر کی تعمیر کردی جائے تو کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور پوجا پاٹ جو اس وقت کی جاتی ہے اسی طریقہ پر مستقبل میں بھی جاری رہے گی، لہٰذا مدعی نے درخواست کی ہے کہ اس کے نام

مذکورہ چبوترے کے اوپر ایک مندر بنانے کی اجازت پر مشتمل ایک حکم جاری کیا جائے، اس مقدمہ کے لیے قانونی چارہ جوئی کی علت کے وقوع کی تاریخ ۱۵ر جون ۱۸۸۴ء معلوم ہوتی ہے، فاضل سرکاری مختار نے اپنے تحریری بیان میں کہا ہے کہ مدعی کو چبوترے سے بے دخل نہیں کیا گیا ہے، لہٰذا اس مقدمہ کے لیے قانونی چارہ جوئی کی کوئی علت مدعی کے پاس موجود نہیں ہے اور اس مقدمہ کی قانونی مدت چارہ جوئی محدود ہے اور مدعی اس ریلیف کا حق دار نہیں ہے جس کا اس نے دعویٰ کیا ہے، محمد اصغر مدعی علیہ نے اپنے تحریری بیان میں مندرجہ ذیل حقائق پیش کیے ہیں، جو مختصراً اس طرح ہیں:

عرضی دعویٰ پر ادائیگی کی گئی کورٹ فیس ناکافی ہے، کورٹ فیس عمارت کی مالیت کے اعتبار سے ادا کی جانی چاہیے تھی اور یہ کہ مقدمہ قانونی لحاظ سے تمادی ہو چکا ہے اور زمین کا رقبہ جسے چبوترے کی حیثیت سے دکھایا گیا ہے کافی زیادہ ہے اور وہ زمین مدعی کے قبضہ میں نہیں ہے اور مدعی کو مذکورہ زمین پر کوئی مندر بنانے سے متعدد مرتبہ روکا جا چکا ہے۔ مقدمہ کے حقائق کے پیش نظر درج ذیل نکات تحقیق طلب تنقیح قرار پاتے ہیں۔

(۱) کیا عدالتی فیس جو ادا کی گئی ہے، کافی ہے؟

(۲) کیا مقدمہ قانونی مدت سماعت کے ذریعہ محدود ہے؟

(۳) اگر نہیں تو کیا قانونی چارہ جوئی کی کوئی علت ہے؟

(۴) جو ریلیف طلب کی گئی ہے، قانوناً جائز ہے، یا نہیں؟

(۵) مقدمہ میں زیر بحث چبوترے کی آراضی کیا ہے؟

(۶) چبوترے کے نام سے معروف مذکورہ زمین متعلقہ فریقوں میں سے کس کی ملکیت اور قبضہ میں ہے؟

ان میں سے سوالات نمبر ۱، ۳، ۴، اور ۶ کا بار ثبوت مدعی کے ذمہ ہے اور سوال نمبر

۲ کا ثبوت مدعیٰ علیہ کو فراہم کرنا ہے، جب کہ سوال نمبر ۵ کا تعلق پیمائش سے ہے، سوال نمبر ۶ کے تحت مدعی کے دعویٰ کی تردید مدعیٰ علیہ کو کرنی ہے، متنازعہ جگہ کا نقشہ گوپال سہائے امین کے ذریعہ تیار کیا گیا اور ریکارڈ میں شامل کیا گیا، متعلقہ جگہ کے معاینہ کے وقت جو ترمیم بھی ضروری سمجھی گئی، عمارت میں وہ ترمیم نقشہ میں شامل کی گئی ہے، متعلقہ فریقوں کی جانب سے مذکورہ بالا نکات کے ثبوت میں درج ذیل دستاویزات فائل کی گئی ہیں:

مدعی کے ذریعہ فراہم کردہ دستاویزی ثبوت۔

گزیٹیر آف اودھ جلد ۷ سے اقتباس کی نقل جو کہ حکومت کے آرڈرس کے تحت ضروری تھی، اقتباس برائے جنرل، ہسٹارک سوسائٹی مع ترجمہ اردو۔

مدعیٰ علیہ کی طرف سے فراہم کردہ دستاویزی ثبوت۔

قائم مقام ڈپٹی کمشنر ایم مزبھا کا آرڈر، جس کے ساتھ آرڈر کی نقل منسلک کی گئی۔
رسوئی کے انہدام سے متعلق اسسٹنٹ کمشنر مسٹر ڈ مسوئر کا فیصلہ اور ڈپٹی کمشنر مسٹر اوڈنیرور کی اجازت۔

پرچہ پر سابق ڈپٹی کمشنر مسٹر فارڈس کے دستخط ہیں، تاریخ ۲۸ر فروری ۱۸۷۷ء ڈپٹی کمشنر کے آرڈر مجریہ ۶ر دسمبر ۱۸۹۸ء کی نقل۔

رجب علی بنام الن سنگھ کے مقدمہ میں شاہ کی عدالت سے دیے گئے فیصلہ کی نقل مورخہ ۳ر دسمبر ۱۸۶۰ء و ۱۳ر مارچ ۱۸۶۱ء۔

نزول لینڈ کے داروغہ بھیلا ناتھ کی طرف سے دیے گئے ریمارکس مورخہ ۸ر ستمبر ۱۸۶۶ء کی نقل۔

نقل آرڈر مرزا خداداد بیگ بمطابق اجازت ڈپٹی کمشنر مورخہ ۱۲ر جنوری ۱۸۸۴ء۔
نقل آرڈر اسسٹنٹ کمشنر سید محمد اصغر بنام گووند رام۔

نقل عذرداری منجانب گورکھ سنگھ ساکن لاہوا، مورخہ ۱۸ر مئی ۱۸۸۳ء۔

نقل عذرداری اور آرڈر.........مورخہ ۱۷رجنوری ۱۸۶۵ء۔

جائے وقوع کی ایک انکوائری متعلقہ فریقوں، ان کے مختار وکیلوں اور نزول لینڈ کے داروغہ کی موجودگی میں کی گئی، مدعی اور محمد اصغر مدعی علیہ کی جانب سے گواہ پیش کیے گئے اوران کے بیانات ریکارڈ کیے گئے، یہ ضروری نہیں سمجھا گیا کہ ریاست کی جانب سے کوئی عینی شاہد پیش کیا جائے، فریقوں کے مختاروں کے ایشو نمبر ا سے متعلق دلائل سننے کے بعد یہ واضح ہے کہ مدعی جس دادرسی کا طالب ہے وہ اس نوعیت کی ہے کہ مندر کی تعمیر کی اجازت دی جاسکتی ہے، محمد اصغر کی جانب سے لگائے گئے اعتراضات یہ ہیں کہ عدالتی فیس کی ادائیگی تعمیر کیے جانے والے مندر کی مالی قیمت پر ادا کی جانی چاہیے یا اس کا تخمینہ چبوترے کی مالی قیمت کی بنیاد پر لگایا جانا چاہیے، ۱۸۷۰ء کے قانون کے جزء دوم دفعہ نمبر ۱۷، کلاز نمبر ۶ کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مقدمہ میں زیر بحث جائداد کی قیمت کا تعین بازار کی شرح کے مطابق کیا جاسکتا ہے اور اس پر دس روپے کا اسٹامپ کافی ہے، مندر کی تعمیر ایک سو روپے میں ہوسکتی ہے، ایک ہزار میں بھی اور کئی ہزار روپے میں بھی، اس کی کوئی حد نہیں ہوسکتی، لہذا اس طرح کی تعمیر کی اجازت کے لیے بازار کی شرح کے مطابق کوئی قدر انداز نہیں ہوسکتی، چبوترے پر قبضہ کے سلسلہ میں کوئی دعویٰ نہیں ہے، اس لیے عدالتی فیس چبوترے کی قیمت پر عائد ہوسکتی ہے اور اس بنا پر دس روپے کا اسٹامپ کافی ہے۔

جہاں تک ایشو نمبر ۲ کا تعلق ہے، میرے علم میں بات لائی گئی ہے کہ ضابطہ فوجداری دفعہ ۱۴۵ کے تحت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی اجازت سے کوئی اطلاع مدعی کو نہیں دی گئی ہے جس کی منسوخی کا وہ حق دار ہے، گورکھ سنگھ (پنجابی) نامی ایک شخص مندر کی تعمیر کے لیے پتھر لایا تھا، ڈپٹی کمشنر کی طرف سے گورکھ سنگھ کے نام حکم اس مفہوم کا ہے کہ اسے وہاں

سے پتھر ہٹا لینا چاہیے، مذکورہ افسر کا یہ آرڈر اس معنی میں واضح ہے کہ مندر کی تعمیر کی اجازت گورکھ سنگھ کو نہیں دی جا سکتی تھی، جو منشی رام لال اور رام مراری رائے بہادر کا کارندہ ہے، جو مندر کی تعمیر کے لئے پتھر لایا تھا اور کمشنر نے اپیل اس بنیاد پر مسترد کر دی تھی تا کہ اس سلسلہ میں کوئی پیشگی منظوری جو از روئے قانون ضروری ہے، نہیں لی گئی ہے، چوں کہ مدعی پر چبوترے پر مندر کی تعمیر کے سلسلہ میں کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی، اس لیے وہ پابندی سے متعلق کسی حکم کی منسوخی کے حصول کا پابند نہیں ہے، سرکاری وکیل مختار کی جانب سے جو کیس پیش کیا گیا ہے، وہ مناسب محل نہیں ہے، کیوں کہ میرے سامنے جو معاملہ پیش کیا گیا ہے اس میں مدعی کے خلاف ایک آرڈر جاری کیا گیا ہے جب کہ زیر نظر معاملہ میں چبوترے پر مندر کی تعمیر کے تعلق سے مدعی کے خلاف کوئی آرڈر جاری نہیں کیا گیا ہے، اس کے علاوہ ۱۸۷۷ء کے ایکٹ نمبر ۵ کی دفعہ نمبر ۲۴ کو دیکھتے ہوئے یہ واضح ہے کہ اس قسم کے معاملات میں مقدمات کسی بھی وقت داخل کیے جا سکتے ہیں، کیوں کہ ہر اس موقع پر اجازت دینے سے انکار کیا جائے، چارہ جوئی کی تازہ علت یہ ہوگی اور ایک نیا مقدمہ داخل عدالت کیا جا سکتا ہے، مزید برآں اس طرح کے مقدمات کے لیے قانون تمادی کی کوئی متعین دفعہ موجود نہیں ہے، چنانچہ یہ مقدمہ تمادی نہیں ہوا ہے۔

رہا تیسرا مسئلہ تو مدعیٰ علیہ کے عذر تمادی کی غیر موجودگی میں علت چارہ جوئی فراہم ہو چکی ہے اور یہ کہ جو علت چارہ جوئی مدعی کو حاصل ہوئی ہے، وہ غلط ہے اور اس کے ساتھ ہی مدعی کو چبوترے پر مندر کی تعمیر سے روکا جا رہا ہے اور لوکل گورنمنٹ کے نام مدعی کی درخواست پر کوئی آرڈر جاری نہیں ہوا ہے، لہذا علت چارہ جوئی فی الواقع مدعی کو حاصل ہوگئی ہے اور مدعی نالش کرنے کا حق دار ہے۔

رہا تیسرا مسئلہ تو جائے وقوع کی پیمائش کی گئی ہے اور یہ پیمائش مقدمہ میں پیش

کیے گئے نقشہ کے مطابق درست پائی گئی ہے اور محمد اصغر کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا ہے، جب کہ دوسری طرف یہ پیمائش انچوں میں کم اور فٹ کے اعتبار سے درست ہے۔

جہاں تک ایشو نمبر ۲ کا تعلق ہے اس جگہ کے معاینہ کے بعد یہ واضح ہے کہ چرن (پاؤں) چبوترے پر ابھارا ہوا ہے جس کی پوجا کی جاتی ہے، اس چبوترے پر بنے ہوئے ایک اور چبوترے پر ٹھاکر جی کی ایک مورتی نصب کی ہوئی ہے، چبوترہ مدعی کے قبضہ میں ہے اور وہاں جو بھی چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں، انہیں مدعی لے جاتا ہے اور اس کا اعتراف محمد اصغر مدعیٰ علیہ کو بھی ہے، مدعی کے گواہ بھی مدعی کا قبضہ ثابت کرتے ہیں، اسی وجہ سے وہاں باڑ کی طرح ایک پختہ دیوار مسلمانوں اور ہندوؤں کی مقبوضہ اراضی کی حدود متعین کرنے کے لیے بنائی گئی ہے، اس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا، مدعی کے گواہ چبوترے پر مدعی کے قبضہ سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کرتے ہیں، مسجد اور چبوترے کے درمیان ایک دیوار ہے جسے امین کے تیار کردہ تصحیح شدہ نقشے میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ مسجد اور چبوترے کے درمیان الگ الگ باونڈری ہے، اس کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ وہاں حالیہ تنازع سے قبل حکومت کی جانب سے تعمیر کردہ ایک باونڈری لائن موجود ہے، اس سے قبل ہندو اور مسلم دونوں ہی اس مقام پر نماز اور پوجا کا کام کرتے تھے، ۱۸۵۵ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑے کے بعد مزید جھگڑوں کا امکان ختم کرنے کے لیے درمیان میں ایک دیوار بنادی گئی، تاکہ مسلمان دیوار کے اندرونی جانب عبادت کریں اور ہندو دیوار کی باہری جانب پوجا کریں، لہذا چبوترہ اور چہار دیواری کے باہر کی زمین ہندوؤں اور مدعی کی ہے۔

اب رہ جاتا ہے چوتھا مسئلہ جس پر مقدمہ خارج کیے جانے یا اس پر کوئی حکم جاری کیے جانے کا انحصار ہے، یہ مقام دوسرے مقامات کی طرح نہیں ہے، جہاں اس کے مالک کو

اپنی پسند سے کوئی بھی عمارت بنانے کا حق حاصل ہوا، نقشہ کے معاینہ سے یہ پتہ لگایا جا
ہے کہ صورت حال ایسی ہی ہے، مندر کی تعمیر کے لیے اجازت کی درخواست ایک ایسی جگہ
سے متعلق ہے، جہاں مندر اور مسجد دونوں میں داخلہ کا صرف ایک ہی دروازہ ہے، وہ جگہ
جہاں ہندو پوجا کرتے ہیں، قدیم زمانہ سے ان کے قبضہ میں ہے اور ان کی ملکیت میں کوئی
کلام نہیں ہوسکتا اور اس کے گرد مسجد کی دیوار ہے اور اس دیوار پر ''اللہ'' کا لفظ کندہ ہے، اگر
ایسے مقام پر چبوترے پر کوئی مندر بنایا جاتا ہے تو جب ہندو اور مسلمان دونوں ہی ایک ہی
راستہ سے گذریں گے تو مندر کی گھنٹیوں اور سنکھ کی آواز گونجے گی، اگر ہندوؤں کو مندر کی تعمیر
کی اجازت دے دی جائے تو ایک نہ ایک دن کوئی ہنگامہ شروع ہو کر رہے گا اور ہزاروں
افراد ہلاک ہوں گے، نظم و قانون کی پامالی کے اس سبب کے تحت متعلقہ فریقوں کو کسی بھی نئی
تعمیر سے روک دیا ہے، لہٰذا یہ عدالت بھی معقول اور مناسب تصور کرتی ہے کہ اس مقام پر
مندر کی تعمیر کی اجازت دینا فساد اور خوں ریزی کی بنیاد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان
ڈالنا ہے، جو دو مختلف مذہبوں کے ماننے والے ہیں، لہٰذا جو دادرسی چاہی گئی ہے وہ بہ
تقاضائے انصاف منظور نہیں کی جانی چاہیے، قانون اقرار عہد کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ عدالت
اس امر واقعہ سے واقف ہے کہ کسی بھی فریق کو اقرار عہد کی ہدایت نہیں دی جانی چاہیے جو کہ
پبلک پالیسی کے خلاف ہے۔

ان اسباب کے تحت جو اوپر بیان کیے گئے ہیں، عدالت کی رائے میں مدعی کی
جانب سے جو ریلیف طلب کی گئی ہے وہ قانون کے مطابق نہیں ہے اور یہ مسئلہ (۴) مدعا
علیہ فریقان کے حق میں فیصل کیا جاتا ہے اور دیگر مسائل مدعی کے حق میں فیصل کیے جاتے
ہیں اور اس کی رو سے ہدایت کی جاتی ہے کہ سی، پی، سی کی دفعہ ۱۹۸ کے تحت مدعی کا مقدمہ
خارج کیا جائے، دونوں فریقان اپنے اپنے اخراجات برداشت کریں، مقدمہ کی مثل ریکارڈ

قوم کے حوالہ کی جائے۔ دستخط ہری کشن سب جج تاریخ ۲۴ر دسمبر ۱۸۸۵ء

(بہ شکریہ مسلم انڈیا اردو، مئی ۱۹۸۶ء)

تبصرہ: اس فیصلہ میں جو یہ بات کہی گئی ہے کہ ''اس کے قبل مسلمان اور ہندو دونوں ہی اس مقام پر نماز پڑھتے اور پوجا کرتے تھے'' تو یہ انگریزوں ہی کی آواز بازگشت ہے، اس مقام سے مراد اگر مسجد ہے تو یہ صحیح نہیں اور اگر اس مقام سے مراد مسجد اور چبوترہ کی جگہیں ہیں تو پھر مقام کا لفظ قابل قبول ہے اور پھر فیصلہ میں یہ بھی ہے کہ ''مندر کی تعمیر کے لیے اجازت کی درخواست ایک ایسی جگہ سے متعلق ہے جہاں مندر اور مسجد دونوں میں داخلہ کا صرف ایک ہی دروازہ ہے'' اس سے تو ظاہر ہے کہ مسجد کے پاس مندر بھی تھا، مگر جب وہاں مندر تھا تو چبوترہ پر مندر بنانے کی اجازت کیوں مانگی گئی، یہاں پر مندر سے مراد شاید چبوترہ ہی ہو جہاں ہندو پوجا کرتے تھے اس کی تصریح اس اپیل کی سماعت سے ہو جاتی ہے جو اس فیصلہ کے بعد ایک انگریز ڈسٹرکٹ جج کے یہاں کی گئی تھی اس اپیل کے فیصلہ میں ڈسٹرکٹ جج نے لکھا تھا ''احاطہ میں داخلہ ایک پھاٹک کے راستہ سے ہے جس پر اللہ کا لفظ کھدا ہوا ہے، اور ٹھیک بائیں جانب سمنٹ کا بنا ہوا چبوترہ ہے، جس پر ہندوؤں کا قبضہ ہے، اس چبوترہ پر ایک خیمہ کی شکل کا لکڑی کا ایک ڈھانچہ بنا ہوا ہے''۔ اسی لکڑی کے ڈھانچہ کو ڈسٹرکٹ سب جج نے شاید مندر کہا ہے، ان کے فیصلہ کا سب سے اہم جزء یہ ہے: ''وہ جگہ جہاں ہندو پوجا کرتے ہیں، قدیم زمانہ سے ان کے قبضہ میں ہے اور ان کی ملکیت پر کوئی کلام نہیں ہو سکتا اور اس کے گرد مسجد کی دیوار ہے، دیوار پر ''اللہ'' کا لفظ کندہ ہے، اگر ایسے مقام پر چبوترے پر کوئی مندر بنایا جاتا ہے تو جب ہندو اور مسلمان دونوں ہی ایک ہی راستہ سے گذریں گے، مندر کی گھنٹیوں اور سنکھ کی آواز گونجے گی، اگر ہندوؤں کو مندر کی تعمیر کی اجازت دے دی جائے تو ایک نہ ایک دن کوئی ہنگامہ شروع ہو جائے گا اور ہزاروں افراد ہلاک ہوں گے، نظم و قانون کے

پامال ہونے کے اس سبب کے تحت نئی تعمیر سے روک دیا، لہذا یہ عدالت بھی معقول ا
مناسب تصور کرتی ہے کہ اس مقام پر مندر کی تعمیر کی اجازت دینا فساف اور خوں ریزی ک
بنیاد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ڈالنا ہے، جو دو مختلف مذہبوں کے ماننے والے ہیں
، لہذا جو دادرسی چاہی گئی ہے، وہ بہ تقاضائے انصاف منظور نہیں کی جانی چاہیے، قانون اقرار
عہد کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ عدالت اس امر واقع سے واقف ہے کہ کسی بھی فریق کو اقرار عہد کی
ہدایت نہیں دی جانی چاہیے، ان اسباب کے تحت جو اوپر بیان کیے گئے ہیں، مدعی کی جانب
سے جو ریلیف طلب کی گئی ہے، وہ قانون کے مطابق نہیں ہے"۔

اس فیصلہ کے مطابق بابری مسجد کو بالکل ایک مسجد کی حیثیت دے دی گئی، مگر اس
کے خلاف مہنتوں نے جو اپیل کی اس میں بھی مسجد پر قبضہ کرنے کا دعویٰ نہیں کیا گیا، بلکہ
چبوترہ پر مندر بنانے کا اصرار کیا گیا۔

فیصلہ کے خلاف اپیل اور اس کی نامنظوری: مہنتوں کی یہ اپیل فیض آباد
کے ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں ہوئی جو اس وقت ایک انگریز تھا، اس نے جو اس اپیل پر
فیصلہ دیا وہ بھی ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

"ڈسٹرکٹ جج فیض آباد، کرنل ایف.ای. چمپیر۔
کا فیصلہ بسلسلہ سول اپیل نمبر ۲۷، ۱۸۸۵ء
مہنت رگھوبیر داس مدعی بنام سکریٹری آف اسٹیٹ آف انڈیا
محمد اصغر - مدعی علیہ

میں نے گذشتہ روز جملہ فریقوں کی موجودگی میں متنازع اراضی کا معاینہ کیا، میں
نے دیکھا کہ بادشاہ بابر کی تعمیر کردہ مسجد شہر اجودھیا کی سرحد پر واقع ہے، یعنی مغرب اور
جنوب میں جس کے قریب مکانات نہیں ہیں، یہ بات افسوسناک ہے کہ ایک مسجد ایک ایسی

زمین پر بنائی گئی جو ہندوؤں کے نزدیک خاص تقدس رکھتی ہے لیکن چوں کہ یہ واقعہ آج سے ۳۵۶ سال قبل پیش آیا ہے، لہذا اب یہ موقع نہیں ہے کہ اس کا تدارک کیا جاسکے، جو کچھ کیا جاسکتا ہے وہ یہ کہ جملہ فریقان حالت موجودہ کو برقرار رکھیں، اس طرح کے معاملہ میں جیسا کہ یہ ہے کہ کوئی بھی نیا اضافہ کسی فائدے کے بجائے کہیں زیادہ نقصان اور نظم کی ابتری کا باعث بنے گا۔

احاطہ میں داخلہ ایک پھاٹک کے راستہ سے ہے، جس پر ''اللہ'' کا لفظ کھدا ہوا ہے اور ٹھیک بائیں جانب سمنٹ کا بنا ہوا چبوترہ ہے، جس پر ہندوؤں کا قبضہ ہے، اس چبوترے پر ایک خیمہ کی شکل کا لکڑی کا ایک ڈھانچہ بنا ہوا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ یہ چبوترہ رام چندر جی کی جائے پیدائش ہے، دروازہ کے سامنے مسجد کے پختہ چبوترے کی طرف داخلہ کا راستہ ہے، ایک باڑ دار دیوار مسجد کے چبوترے کو اس احاطہ سے الگ کرتی ہے، جس پر چبوترہ واقع ہے۔

سب جج کے الفاظ ہیں: ''باہر کے درجہ کی اراضی مع چبوترہ مقبوضہ مدعی اور ہندو لوگوں کی ہے، جو اس مقام پر ہندو پرستش کرتے ہیں، قدیم قبضہ ان کا ہے، جس میں ملکیت ان کی میں کلام نہیں ہوسکتا ہے'' یہ الفاظ غیر ضروری ہیں اور انہیں فیصلہ سے نکال دینا چاہیے، واحد سوال جو اس فیصلہ میں طے کیا گیا ہے یہ کہ متعلقہ فریقوں کی موجودہ پوزیشن برقرار رکھی جائے، اس مقدمہ کے اصل مدعا کی وضاحت کل بی ککول نے کی، جب کہ ہم لوگ مسجد کے پاس کھڑے تھے، یعنی یہ کہ کسی اور حمایت اور جانب داری سے کام نہ لینے والی حکومت کی حیثیت سے برطانوی حکومت سے اس کی عدالتوں کے واسطے سے یہ درخواست کی گئی ہے کہ وہ ایک مسلم بادشاہ کے ذریعہ کی گئی ناانصافی کا تدارک کرے، ڈپٹی کمشنر کا موقف یہ ہے کہ اس معاملہ میں سول کورٹ کو اختیار سماعت نہیں ہے، اس کے تحت جو دادرسی

چاہی گئی ہے وہ ۱۸۷۷ء کے ایکٹ نمبر ا کی دفعہ ۵۶ کلاز (ڈی) کے خلاف ہے، میرے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ۱۴ ر مئی ۱۸۸۳ء کے آرڈر کے بارے میں کس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حکومت ہند یا لوکل گورنمنٹ کے کسی محکمہ کے عوامی فرائض کی انجام دہی کے تعلق سے جاری کیا گیا ہے، اس کے برعکس مدعی کا بیان یہ ہے کہ لوکل گورنمنٹ نے اس کی درخواست کا کوئی جواب اسے نہیں بھیجا، اگر یہ کہا جائے کہ ۱۵ ر مئی ۱۸۸۳ء کا آرڈر کسی مجسٹریٹ کے ذریعہ جاری کیا گیا تھا، تو ضابطۂ فوجداری کی اس دفعہ کا حوالہ دیا جانا چاہیے جس کے تحت وہ آرڈر جاری کیا گیا تھا۔

V. I. L. R. MED کے صفحہ نمبر ۳۸۴ پر یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ افراد کو خواہ ان کا تعلق کسی بھی گروہ سے ہو، عمارتیں بنانے اور ان میں عام پرستش کرنے کی آزادی ہے، بشرطیکہ وہ نہ تو اپنے دوسرے پڑوسیوں کو حاصل جائیداد اور ملکیت کے حق میں دخل انداز ہوں اور نہ وہ اس کے ذریعہ عوامی دشواری اور پریشانی وغیرہ کا باعث بنیں، نیز بشرطیکہ یہ کام ان ہدایات کے مطابق ہو جو مجسٹریٹوں کی جانب سے عام راستوں میں رکاوٹ یا امن عامہ میں خلل اندازی کو روکنے کے لئے قانونا جائز طریقہ پر جاری کی جائیں، اگر ایک کام کو حکومت کے ذریعہ کیا گیا کام سمجھا جائے اور یہ کہ اس کام کے اس حصہ میں جو ڈپٹی کمشنر نے انجام دیا ہے، اس نے محض ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے پوری نیک نیتی کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی کے طور پر کام کیا ہے تو اگر ڈپٹی کمشنر کا اقدام بجائے خود مدعی کے خلاف غلط ہو اور اس سے نقصان پہنچے، تو مدعی کو اس کی تلافی کی صورت، اس کام کے انجام دینے کے خلاف چارہ جوئی کے ذریعہ حاصل ہونی چاہیے، خواہ وہ کام اس کے انجام دینے والے نے اپنی طرف سے کیا ہو، یا بالاتر قوت کے حکم کے تحت انجام دیا ہو۔

لوکل گورنمنٹ کی شہر کی ذمہ داری و جوابدہی کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا، اگر اس

کے نمائندے کسی مجرمانہ حرکت کے لیے جواب دہ نہ ہوں، اس مقدمہ کے خارج کیے جانے کا سبب یہ ہے کہ کوئی ایسی بنیاد موجود نہیں ہے جو مدعی کو چارہ جوئی کا حق دے سکے۔

سول کورٹ کے اختیار سماعت کے محدود ہونے کے بارے میں جن نتیجوں تک میں پہنچا ہوں ان کا تعلق ''عوامی حق کے مسئلہ سے ہے، جس کا تعین کسی مجسٹریٹ نے کیا ہو مثال کے طور پر ایک سول کورٹ کسی مجسٹریٹ کے جاری کردہ ایک آرڈر کو جس میں ایک سڑک کو عام سڑک قرار دیا گیا ہو، کالعدم کرنے کے مقدمہ کی سماعت نہیں کر سکتا۔

یہ اپیل خارج ہوگئی، چوں کہ محمڈن مدعیٰ علیہ نے اس مقدمہ میں اپنی مرضی سے مداخلت کی ہے، لہٰذا اس کے اخراجات کا نہ عدالتی فیس اور نقول کے اخراج کی حد تک مدعی کے ذریعہ ادا کیے جائیں گے۔

سرکاری وکیل کو ہر ایک عدالت میں سولہ روپے کے اخراجات کی ادائیگی کی اجازت دی جاتی ہے۔

(دستخط ایف. ای. چمپیر ڈسٹرکٹ جج)

(بہ شکریہ مسلم انڈیا اردو مئی ۱۹۸۶ء)

تبصرہ: اس فیصلہ سے ظاہر ہے کہ انگریز ڈسٹرکٹ جج نے اپیل نامنظور کر دی، مگر اس کو خارج کرنے میں اپنی سامراجیت کا بھی مظاہرہ کیا، وہ سمجھتا تھا کہ اگر یہ جھگڑا ختم ہو گیا تو یہ سارا کھیل ہی بگڑ جائے گا، اس لیے اس نے پہلے تو یہ لکھا کہ:

''میں نے گذشتہ روز فریقوں کی موجودگی میں متنازعہ فیہ اراضی کا معاینہ کیا، میں نے دیکھا کہ بادشاہ بابر کی تعمیر کردہ مسجد شہر اجودھیا کی سرحد پر واقع ہے، یعنی مغرب اور جنوب میں جس کے قریب مکانات نہیں ہیں''۔

یہ کہنا تو صحیح نہیں کہ اس کے قریب مکانات نہیں تھے اور یہ کون ثابت کرے

جس زمانہ میں یہ مسجد بنی اس زمانہ میں بھی مکانات نہ تھے، یہ بات صرف اس لیے لکھی گئی ہے کہ ہندوؤں کو یقین دلایا جائے کہ اس ویرانہ میں محض رام جنم بھومی کو مسمار کرنے کی خاطر یہ مسجد بنائی گئی اور جب وہ ویران جگہ تھی تو پھر جنم استھان مندر وہاں پر کیسے تھا، اس کے بعد جو حسب ذیل تحریر ہے وہ ایک مقدمہ میں لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔

''یہ بات افسوس ناک ہے کہ ایک مسجد ایک ایسی زمین پر بنائی جائے جو ہندوؤں کے نزدیک خاص تقدس رکھتی ہے''۔

جو بات پہلے انگریزوں نے قیاساً لکھی تھی، اس کو یہاں پر پورے وثوق کے ساتھ لکھا گیا ہے، اس سے شرانگیزی ہی تو مراد تھی، جھگڑے کو برقرار رکھنے کی خاطر یہ بھی تحریر کیا گیا:

''لیکن یہ واقعہ آج سے ۳۵۶ سال قبل پیش آیا، لہٰذا اب اس کا موقع نہیں کہ اس کا تدارک کیا جاسکے، جو کچھ کیا جاسکتا ہے وہ یہ کہ جملہ فریقین حالت موجودہ کو برقرار رکھیں، اس طرح کے معاملہ میں جیسا کہ یہ ہے کوئی بھی نیا اضافہ کسی فائدے کے لیے کیا گیا تو کہیں زیادہ نقصان اور نظم کی ابتری کا باعث نہ بن جائے''۔

فیض آباد کے ڈسٹرکٹ سب جج کے فیصلہ کے ایک ٹکڑے کا یہ حوالہ دیا گیا:

''باہر کے درجہ کی اراضی مع چبوترہ مقبوضہ مدعی اور ہندو لوگوں کی ہے جو اس مقام پر ہندو پرستش کرتے ہیں، قدیم قبضہ ان ہی کا ہے، ان کی ملکیت میں کوئی کلام نہیں''۔

اس کے متعلق انگریز ڈسٹرکٹ جج نے یہ لکھا:

''یہ الفاظ غیر ضروری ہیں، انہیں فیصلہ سے نکال دیا جائے''۔

اس سے ظاہر ہے کہ ڈسٹرکٹ جج نے مسلمانوں کو بھی اکسایا کہ وہ چبوترے کو

ہندوؤں کی ملکیت قرار نہ دیں۔

رام جنم استھان کا چبوترہ: یہ چبوترہ کب بنا، اس کی صحیح تاریخ کسی مستند تاریخ سے نہیں بتائی جا سکتی ہے، پانیر اخبار لکھنؤ مورخہ ۱۰؍۱۱ جنوری ۱۹۸۶ء میں اس کے ایک کالم نگار نے لکھا ہے کہ اکبر کے زمانہ میں ہندو اس جگہ پر بیس مرتبہ حملہ آور ہوئے تو اس نے راجہ ٹوڈرمل اور بیربل کو اجودھیا بھیجا، دونوں نے وہاں کے مہنتوں سے گفتگو کی اور اس پر سمجھوتہ ہوا کہ مسجد کے بائیں جانب ایک چبوترہ رام مندر کے نام سے بنا دیا جائے، تاکہ ہندو وہاں آکر پوجا اور درشن کر سکیں، کالم نگار نے اس کا حوالہ اکبر کے زمانہ کی ایک کتاب دیوان اکبری کا دیا ہے، ایسی کوئی کتاب اس زمانہ میں نہیں لکھی گئی اور اگر اس سے مراد آئین اکبری ہے تو پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ایسی کوئی روایت نہیں، یہ محض من گھڑت واقعہ ہے، اگر آئین اکبری میں ایسی کوئی بات لکھی ہوتی تو انگریز مؤرخین اور اہل قلم اس سے پورا فائدہ اٹھا کر اس فتنہ کو آگے بڑھاتے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ نواب واجد علی شاہ کے زمانہ میں انگریزوں نے ایک بدھسٹ نجومی کو اس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ ایک زائچہ کے ذریعہ سے جنم استھان اور سیتا رسوئی گھر کو بابری مسجد کے اندر دکھائے اور ہندو ان جگہوں کو حاصل کرنے کی کوشش کریں، واجد علی شاہ کا وزیر نقی علی خان انگریزوں کا ایجنٹ تھا، اس نے واجد علی شاہ کو اس پر راضی کر لیا کہ حدود مسجد سے باہر رام جنم استھان اور سیتا رسوئی گھر کے لیے جگہ دے دی جائے، چنانچہ مسجد کے مسقف حصہ کے بالمقابل دائیں سمت احاطہ سے متصل سیتا رسوئی کے لیے اور صحن مسجد سے باہر بائیں پورب کی طرف جنم استھان کے طور پر ۲۱ فٹ لمبی اور ۱۷ فٹ چوڑی جگہ دے دی گئی، جس پر ایک بالشت چبوترہ بنانے کی اجازت تھی، اس موقع پر مسجد کے صحن کو لوہے کی سلاخوں سے گھیر دیا گیا جو اب تک کھلا ہوا تھا۔

(بہ حوالہ دارالعلوم دیوبند مارچ،اپریل ۱۹۸۶ء)

یہ روایت کسی مستند معاصر تاریخ میں نظر سے نہیں گذری، مگر مسجد کو لوہے کی سلاخوں سے گھیر دینے کی زوایت تو قیصر التواریخ جلد دوم ص ۱۱۲ میں ہے اور اسی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد سیتا رسوئی گھر کے پاس بنی اور جمہور اس کو سیتا رسوئی کی مسجد بھی کہتے تھے، (ج ۲ ص ۱۱۷) مگر یہ بات ذرا مشکوک ہے کہ واجد علی شاہ نے مسجد کے باہر چبوترہ بنانے کی اجازت دی، کیوں کہ ۱۸۵۸ء میں بابری مسجد کے خطیب اور مؤذن کی طرف سے جو مقدمہ دائر ہوا ہے اس کی درخواست میں درج ہے کہ مقام جنم استھان صدہا برس سے پریشان یعنی خالی پڑا رہتا تھا اور وہیں ہندو آکر پوجا کرتے تھے، مگر انہو ں نے ''شباشب'' ایک چبوترہ تھانیدار کی سازش سے بنالیا، تو اس کو منہدم کردینے کی درخواست دی گئی لیکن یہ منہدم نہیں کیا گیا، مہنت امتناعی حکم کے باوجود اس میں کچھ نہ کچھ اضافے کرتے رہے۔

۱۸۸۵ء کے مقدمہ کے فیصلہ کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں خاموش ہوگئے اور بابری مسجد کے لیے کوئی مزید جھگڑا نہیں ہوا، مسلمان اس میں نمازیں ادا کرتے رہے، جس کے معنی یہ تھے کہ ہندوؤں نے بھی تسلیم کرلیا کہ یہ مسجد ہے، اس میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے کا حق ہے، مگر انگریز اس تنازع کو زندہ رکھنا چاہتے تھے، اس لیے اپنی کسی نہ کسی تحریر میں ہندوؤں کو یہ لکھ کر مشتعل کرتے رہے کہ بابری مسجد رام جنم بھومی کی جگہ پر بنائی گئی جس کی ایک مثال ۱۹۰۵ء کا فیض آباد گزیٹیر ہے۔

۱۹۰۵ء کا فیض آباد گزیٹیر: ۱۹۰۵ء میں ایچ. آر. نیویل نے فیض آباد گزیٹیر مرتب کیا تو پہلے اس کے ص ۱۵۳ پر یہ لکھا:

''۱۵۲۸ء میں بابر نے اس روایتی جگہ پر اجودھیا میں مسجد

بنائی جہاں رام پیدا ہوئے تھے، پھر اس کے صفحہ ۱۷۲ پر یہ تحریر کیا:

ساتویں صدی سے ایک طویل مدت کے لیے یہ جگہ یعنی اجودھیا تقریباً ویران ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے، اگر چہ مسلمانوں کے عہد میں اس کی اہمیت پھر ہوگئی کیوں کہ انہوں نے اس کو ایک بڑے صوبہ کی راجدھانی بنالیا لیکن ہندو اس کو مقدس جگہ سمجھتے رہے، یہ بات اس سے ظاہر ہے کہ بابر اور اورنگ زیب نے اس کی بے حرمتی کی، بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسلمان حاکم کی موجودگی اور اس کے دربار کی وجہ سے ہندوؤں کی مقدس جگہیں پس پشت پڑ گئیں"۔

پھر وہ ص ۱۷۴۔۱۷۳ پر یہ لکھتا ہے:

"یہ زبانی روایت سے یقین کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات کے زمانہ میں اجودھیا میں تین اہم ہندو عبادت گاہیں تھیں، چھوٹی چھوٹی بھی رہیں، یہ تین جگہیں رام جنم استھان مندر، سورگ دوار اور تیرتیا کا ٹھاکر تھیں، ان میں سے ہر ایک پر مختلف مسلمان حکمرانوں کی نظر رہی، جنم استھان رام کوٹ میں تھا، یہ رام کی پیدائش کی جگہ بتائی جاتی ہے، ۱۵۲۸ء میں بابر اجودھیا آیا اور یہاں ایک ہفتہ ٹھہرا اسی نے یہاں ایک پرانے مندر کو منہدم کیا اور اس کی جائے وقوع پر ایک مسجد بنائی جو بابری مسجد کے نام سے جانی جاتی ہے، اس میں پرانی عمارت کے زیادہ تر سامان لگائے گئے اس کے بہت سے ستون اچھی حالت میں ہیں، وہ Close grainet کالے پتھر ہیں، جن کو وہاں کے لوگ کسوٹی کہتے ہیں، ان پر نقش ونگار بنے ہوئے ہیں، ان کی لمبائی سات سے آٹھ فٹ تک ہے، نیچے بیچ اور کیپٹل میں چوکور ہے بقیہ حصہ یا تو گول یا ہشت پہل ہے، مسجد میں دو کتبے ہیں، ایک تو باہر ہے جو اب تک دیکھا جا سکتا ہے اور دوسرا منبر کے پاس ہے، دونوں کتبات فارسی میں ہیں، ان میں ۹۳۵ھ درج ہے، ان کتبات کے مستند ہونے میں کوئی شک نہیں لیکن مسلمانوں کی

تاریخ میں بابر کے اجودھیا آنے کا کوئی ذکر نہیں، یہ واقعہ تقریباً اس وقت کا ہے جب وہ اپنی فوج لے کر بہار کی مہم پر جارہا تھا۔

اس شہر کی مقدس ترین جگہ کی بے حرمتی سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑی تلخی رہی، کئی موقع پر مسلمانوں نے زبردستی جنم استھان پر قبضہ کرلیا، جس کے بعد انہوں نے ہنومان گڑھی پر زبردست حملے کیے، وہ اس کے زینے تک پہنچ گئے لیکن وہ کافی نقصان کے ساتھ پیچھے ڈھکیل دیے گئے، پھر ہندوؤں نے جوابی حملہ کیا اور جنم استھان پر قبضہ کرلیا، جس کے پھاٹک پر پچھتر مسلمان مارے گئے اور جہاں دفن کیے گئے وہ گنج شہیداں کہلایا، شاہ (اودھ) کی فوج کے کئی دستے اس وقت موجود تھے لیکن ان کو مداخلت کرنے کا حکم نہ تھا، اس کے کچھ دنوں کے بعد امیٹھی کے امیر علی نے لکھنؤ میں باضابطہ حملہ کی تنظیم کی، تاکہ وہ ہنومان گڑھی کو برباد کردیں لیکن ان کو اور ان کی فوج کو بارہ بنکی میں روکا گیا، یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک ہندو اور مسلمان دونوں اسی عمارت میں عبادت اور پوجا کیا کرتے تھے لیکن غدر کے بعد سے مسجد کے باہر ایک بیرونی احاطہ بنادیا گیا اور ان کو اندرونی احاطہ میں جانے سے منع کردیا گیا اور ان سے اس چبوترہ پر پوجا کرنے کو کہا گیا جو انہوں نے بیرونی احاطہ میں بنالیا تھا۔

تبصرہ: ایچ۔آر۔ نیویل نے اپنے اس گزیٹر میں وہی باتیں دہرادی ہیں جو ۱۸۷۰ء میں سٹلمنٹ افسر کی رپورٹ اور ۱۸۷۰ء کے گزیٹر میں لکھی گئی تھیں، سطروں کی سطریں بجنسہٖ ان سے لے لی گئی ہیں، البتہ ان میں جو بعض باتیں قیاساً کہی گئی تھیں، نیویل نے ان کو پورے وثوق کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی ہے، وہ یہ لکھتا ہے کہ ۱۵۲۸ء میں بابر نے اس روایتی جگہ پر اجودھیا میں مسجد بنائی، جہاں رام چندر پیدا ہوئے تھے، پھر یہ بھی لکھتا ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں بابر کے اجودھیا آنے کا ذکر نہیں، شاید اس کو اپنی ان متضاد تحریروں کا احساس نہیں رہا، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ”ساتویں صدی سے ایک مدت کے لیے اجودھیا ویران رہا، معلوم

ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں اس کی اہمیت پھر ہوگئی کیوں کہ انہوں نے اس کو ایک بڑے صوبہ کی راجدھانی بنائی''، اس سے تو یہ ظاہر ہے کہ ساتویں صدی کے بعد ہندو اس شہر کو مقدس نہیں سمجھتے تھے، اس لیے یہ ویران ہوتا چلا گیا لیکن نیویل کو خیال ہوا کہ اگر اس کو مقدس جگہ قرار نہ دیا جائے گا تو پھر اس کی قوم کا سامراجی کھیل ہی بگڑ جائے گا، اس لیے وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ہندو اس کو مقدس جگہ سمجھتے رہے اور اس کی کیا خوب وجہ بتائی ہے کہ وہ اس کو مقدس سمجھتے تھے، اس لیے بابر اور اورنگزیب نے اس کی بے حرمتی کی اور پھر وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ یہاں مسلمان حاکم کی موجودگی اور اس کے دربار کی وجہ سے ہندوؤں کی مقدس جگہیں پس پشت پڑ گئیں، یہ جگہ ۱۲۰۵ء کے بعد ہی سے مسلمانوں کے زیر نگیں آ گئی تھی، تو پھر اسی کے بعد ہی سے ہندوؤں نے یہاں کی مقدس جگہوں پس پشت ڈال دیا تھا اس کے تو یہ معنی ہیں کہ انگریزوں ہی نے اس جگہ کے تقدس کا احساس ان کو دلایا، تا کہ وہ یہاں کی مسجدوں اور مندروں کا تنازع شروع کریں، وہ اجودھیا کے تین مندروں یعنی رام جنم استھان، سورگ دوار اور تریتا کا ٹھاکر کے وجود کا ذکر محض زبانی روایتوں کے سہارے کرتا ہے، گو اس نے زبانی روایتیں بھی حاصل کرنے کی خود تکلیف گوارا نہیں کی، بلکہ ۱۸۷۰ء میں کارنیگی کی رپورٹ اور ۱۸۷۷ء کے گزیٹیر میں جو کچھ لکھا گیا تھا، اسی کو دہرا دیا ہے، مگر ان باتوں کو دہرانے میں اس کے بیان میں اختلاف ہے، ۱۸۵۵ء کے جھگڑے کے سلسلہ میں ۱۸۷۰ء کے گزیٹیر میں ہے کہ ہندوؤں نے زبردستی ہنومان گڑھی پر قبضہ کرلیا، مسلمان اس موقع پر ہنومان گڑھی کے زینہ تک پہنچ گئے۔

نیویل نے اپنے گزیٹیر میں لکھا ہے کہ:

''مسلمانوں نے زبردستی جنم استھان پر قبضہ کرلیا، جس کے بعد انہوں نے ہنومان گڑھی پر زبردست حملے کیے''۔

اس کو فروعی اختلاف کہا جا سکتا ہے، لیکن جب نیویل یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں نے جنم استھان پر زبردستی قبضہ کر لیا تو یہ جنم استھان کون سا تھا؟ کارنیگی اور ۱۸۷۰ء کے گزیٹیر کے مرتب ہندوؤں کو خوش کرنے اور ان کو ورغلانے کے لیے بابری مسجد کو جنم استھان ہی کہتے ہیں، نیویل نے بھی ہندوؤں کو اپنی تحریر میں خوش کرنے کے لیے بابری مسجد کو جنم استھان کہا ہے، اس پر زبردستی قبضہ کرنے کے کیا معنی؟ مسلمانوں کی مسجد تھی، اس لیے شاہ غلام حسین اور مولوی امیر علی نے اسی مسجد کو اپنا مورچہ بنایا اور اسی کے اندر اور باہر مقابلہ کر کے جان بحق ہوئے، اس گزیٹیر میں وہ جھوٹ بھی دہرایا گیا ہے، جو کارنیگی نے اپنی ۱۸۷۰ء کی رپورٹ میں لکھا تھا کہ شاہ کی فوج کے دستے نے کوئی مداخلت نہیں کی اور ہندو اور مسلمان دونوں مسجد میں پوجا اور عبادت کرتے آئے تھے۔

مسز اے. اس. بیورج کی شرانگیزی: مسز اے. اس بیورج نے انگریزی میں تزک بابری کا ترجمہ انگریزی میں کر کے اس کو بابر نامہ کے نام سے ۱۹۲۲ء میں شائع کیا، اس میں تعلیقات اور حواشی بہت ہی محنت سے لکھے مگر بابری مسجد کے سلسلہ میں اپنی سامراجی قوم ہی کی ہم نوائی کی، اس کو بابر نامہ یا مغلوں کے عہد کی کسی تاریخ سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بابر نے رام جنم استھان کو مسمار کر کے ایک مسجد بنائی تو اس نے پہلے بابر نامہ کے صفحہ ۶۵۶ پر ۱۹۰۵ء کے گزیٹیر کے مرتب اِچ. آر. نیویل کا بیان نقل کیا، حالاں کہ اس کی تحقیق اور دانشوری کا تقاضا یہ تھا کہ وہ یہ جاننے کی کوشش کرتی کہ یہ کس مستند تاریخی ماخذ کے حوالے سے لکھا گیا ہے، اس سے یہ توقع نہ تھی کہ گزیٹیر کی ایک سنی سنائی روایت کو تاریخی سند قرار دینے کی کوشش کرے گی، اپنی کتاب کے ضمیمہ یو میں بابری مسجد کے کتبات نقل کیے ہیں، ان اشعار کو نقل کر کے ان کی لفظی خوبیوں پر تبصرہ بھی کیا ہے جس میں یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ مسجد جنم استھان بھومی کی جگہ پر بنائی گئی، اس کا ضمیر صاف نہ تھا، اس لیے اپنی کتاب کے صفحہ LXXVI پر نظر

سے چوک جانے والے خفی حروف میں یہ لکھ گئی ہے۔

Presumably the order of the mosque was given during Babur's stay in Aud (Ajodhya) in 934 A.H. at which time he would be impressed by the dignity and sanctity of the ancient Hindu shrine it (at least in part) displaced (.) and like the obedient follower of Muhammad he was in intolerance of Faith would regard the substitution of a temple by mosque as dutiful and worthy. The mosque was founded (in 935 A.H. but no mension of its completion is made in Baburnama. The Diary for 935 A.H. has many minor lacunae, that of the year 934 A.H. has lost much matter breaking off when the account of Aud. might be looked (PLXXVI)

ہم نے یہ انگریزی عبارت یہاں پر قصداً نقل کی ہے، تاکہ اس سامراجی قوم کی ذہنیت ظاہر ہو، جو اردو ترجمہ میں نہ ہوتی، اس گنجلک اور پر پیچ عبارت میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب قیاسات پر مبنی ہے، تحقیق پر نہیں، اس سلسلہ میں اس نے اپنا مؤرخانہ نقد و تبصرہ چھوڑ کر اپنی قوم کی سامراجی ذہنیت سے کام لیا ہے، اوپر کی تحریر (Presumably) (قیاساً)

کے لفظ سے شروع ہوتی ہے، جس کے بعد پوری عبارت مجروح ہو جاتی ہے، بابر
اجودھیا آنے کا مستند ثبوت نہ تھا تو (Presumably) لکھ کر اس کے اجودھیا آ
ذکر کہاں تک صحیح قرار دیا جا سکتا ہے، پھر یہ بھی قیاساً لکھا گیا ہے، کہ بابر یہاں کے ا
مندر یا کم از کم ایک حصہ کے رتبہ اور تقدس سے متاثر ہوا ہوگا اور صریحاً متعصبانہ جھوٹ
یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ محمد ﷺ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو منہ
کر دیا کرتے تھے، بابر آپ کا ایک فرماں بردار پیرو بن کر عدم رواداربن گیا، اس نے خیال
کیا کہ ایک مندر کی جگہ پر ایک مسجد بنا کر اپنے کو ایک فرض شناس اور لائق پیرو ثابت کرد
گا۔ رسول اللہ ﷺ کی جو تعلیم دوسروں کے مذہب اور عبادت گاہوں کے متعلق تھی، اس
ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، اس کے بعد مسز بیورج نے جو کچھ لکھا ہے اس کو شرانگیز جھوٹ کے
سوا کیا کہا جا سکتا ہے، اس قسم کی بات ۱۸۷۷ء کے گزیٹر میں لکھی گئی تھی، مسز بیورج نے اس
کو دوسرے انداز میں دہرا دیا ہے۔

مسز بیورج اپنی قیاس آرائیوں سے کام لے کر یہ بھی لکھتی ہیں، کہ یہ مسجد ۹۳۵ھ
میں مکمل ہوئی مگر بابر نامہ میں اس کی تکمیل کا ذکر نہیں، اس کے ذکر نہ ہونے کی تاویل اپنی
قیاس آرائیوں سے اس طرح کی ہے کہ ڈائری میں ۹۳۵ھ کے بہت سے جزئی واقعات
لکھنے سے رہ گئے ہیں، ۹۳۴ھ کے تو ایسے بہت سے واقعات کھو گئے ہیں، جن سے اودھ کے
متعلق معلومات حاصل ہو سکتے تھے، ان قیاس آرائیوں کی صداقت تسلیم کرنے کی کوشش کو تحقیق
و دانشوری نہیں کہا جا سکتا ہے، یہی باتیں کارنیگی کی رپورٹ اور ۱۸۷۷ء کے فیض آباد کے
گزیٹر میں کہی گئی ہیں، اسی سے متاثر ہو کر مسز بیورج یہ سب کچھ لکھ گئیں، جو یقیناً ان کی
دانشوری پر ایک بدنما داغ ہے۔

اودھ میں بابر کا قیام: بابر نے اپنے اودھ آنے کا جو ذکر کیا ہے، وہ مسز بیورج

کے ترجمہ بابر نامہ میں موجود ہے، اس کی ترتیب عیسوی سنہ کے مطابق اس طرح کی گئی ہے۔

۱۳ر جون ۱۵۲۱ء گومتی عبور کر کے دن رات چلنے کے بعد ہم لوگ دلمو پہنچے، جہاں گنگا کے گھاٹ سے ہماری فوج پار اتری اور جب ہم اپنے لشکر کو لے کر پہنچے تو گھاٹ کے نیچے معجون کھائی۔

۱۰ر جون، دریا عبور کر کے ہم نے ایک دن انتظار کیا، (دوشنبہ ۷ر شوال) تا کہ پوری فوج پار ہو جائے، آج باقی تاشکندی اودھ کی فوج لے کر آیا اور اس نے باریابی حاصل کی۔

۱۴ر جون گنگا کو چھوڑ کر (آٹھویں تاریخ بروز منگل) ایک رات منزل کر کے ہم لوگ ۱۵ر جون (۹ر شوال) کو کورارہ کے پاس ارندی کے کنارے پر اترے، دلمو سے کورارہ بائیس کوس (۴۴ میل) ہے۔

۱۶ر جون جمعرات کو اس مقام سے اندھیرے میں کوچ کیا اور پرگنہ آدم پور کے مخالف میں اترے، ۸ر جون (جمنا) کو پار کر کے دشمنوں کا تعاقب کرنے کے خیال سے چند ملاحوں کو آگے روانہ کر دیا تھا تا کہ کالپی میں جتنی کشتیاں ملیں حاصل کر لیں، کچھ کشتیاں اس رات پہنچیں جب ہم وہاں اترے، جمنا ہی کے ذریعہ ایک گھاٹ مل گیا جہاں لشکر کا پڑاؤ ہونے والا تھا، وہ گرد و غبار سے بھرا تھا، اس لیے ہم لوگ ایک جزیرہ میں ٹھہر گئے اور وہاں کئی روز قیام رہا، دشمنوں کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی، اس لیے باقی شقاول کو کچھ جوانوں کے ساتھ ان کی خبریں لانے کے لیے روانہ کیا۔

۱۷ر جون دوسرے دن (۱۱ر تاریخ بروز جمعہ) ظہر کے وقت باقی آیا، باقی کا ایک فوجی آیا اور خبر لایا کہ باقی نے بِبن اور بایزید کے لشکریوں کو شکست دے دی ہے اور ان کے ایک عمدہ آدمی مبارک خاں جلوانی اور اس کے ساتھ کچھ اور لوگوں کو قتل کر ڈالا ہے، کچھ کٹے ہوئے سر اور ایک زندہ آدمی کو بھی بھیجا ہے۔

۱۸/جون صبح کو (۱۲/تاریخ بروز شنبہ) بخشی شاہ حسین آیا اور اس نے دشمن کے لشکریوں کی شکست کا حال سنایا اور دوسری مختلف خبریں دیں، اسی رات یعنی سنیچر کی رات تیرہویں تاریخ جمنا میں سیلاب آ گیا صبح تک اس پورے جزیرہ میں جس میں ہم لوگ ٹھہرے تھے، پانی بھر گیا، ایک تیر کے فاصلہ پر ہم لوگ دریا کے نیچے چلے گئے اور وہاں ایک خیمہ ڈال کر مقیم ہوئے۔

۲۰/جون دوشنبہ کو جلال تاشکندی ان امراء اور سلاطین کے پاس سے آیا، جو آگے بھیجے گئے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ چڑھائی کہ خبر سن کر شیخ بایزید اور بی بن پرگنہ کی طرف بھاگ گئے، ادھر برسات سر پر آ گئی، ادھر پانچ چھ مہینے سے جو فوج کشی ہو رہی تھی، تو گھوڑے اور دوسرے جانور تھک چلے تھے، اس لیے سلاطین اور امراء کو حکم دیا کہ وہ وہیں ٹھہرے رہیں، جہاں وہ ہیں۔ یہاں تک کہ آگرہ اور دوسرے مقامات سے تازہ ساز و سامان آ جائے، اسی دن عصر کے وقت باقی اور اس کے ساتھ اودھ کی فوج کو رخصت کر کے روانہ کیا، موسیٰ بن معروف فرلی دریائے سرود چھوڑتے وقت حاضر ہوا تھا، اس کو امروہہ کے علاقہ کی تیس لاکھ جاگیر اس کی تنخواہ میں دی اور اس کو ایک خاص خلعت اور گھوڑا دے کر امروہہ جانے کی رخصت عطا کی۔

۲۱/جون جب ادھر سے خاطر جمع کر لی تو منگل کی رات تین پہر پر ایک گھڑی گذرنے کے بعد ہم چل کھڑے ہوئے، کالپی کے پرگنہ بلادر میں دوپہر کو ذرہ دم لیا اور گھوڑے کو دانہ گھاس کھلا کر مغرب کے وقت سوار ہو گئے، رات کو تیرہ کوس چل کر رات کا تیسرا پہر تھا، کالپی کے پرگنہ سوگندپور میں پہنچے اور بہادر خاں سردانی کے مقبرہ میں اتر کو سو رہے، فجر کی نماز کے وقت وہاں سے کوچ کیا، سولہ کوس کا راستہ طے کر کے دوپہر کو اٹاوہ پہنچ گئے، جہاں مہدی خواجہ نے پیشوائی کی، (صفحہ ۶۸۴-۶۸۶)

اوپر کے اقتباس سے تو ظاہر ہے کہ وہ اودھ کے امراء کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے آیا، وہ ایک مندر کو مسمار کر کے ہندوؤں کو اپنے سے خواہ مخواہ کیوں بدظن کرتا، وہ اس سفر میں باقی تاشکندی سے اس کی فوج کے ساتھ ملا جو اجودھیا سے آیا تھا۔ باقی کے نام کے ساتھ اس نے تاشکندی اور شقاول لکھا ہے، گو اس کے نام کے ساتھ کتبہ میں اصفہانی لکھا ہے، جب بابر اس سے ملا تو وہ اس سے یہ نہیں پوچھتا کہ اس نے ایک مندر کو توڑ کر مسجد کی تعمیر کس حد تک کی۔

انگریزوں کی شرانگیزی کا تجزیہ: کارنیگی ۱۸۷۷ء کے فیض آباد گزیٹیر کے مرتب........ڈبلو ڈبلو ہنٹر مسٹر نیول اور مسز بیورج کے اس قسم کے شرانگیز بیانات کا تجزیہ کرنے کی کچھ اور ضرورت ہے۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ انگریز اپنی سامراجیت میں ہندو مسلمان میں باہمی نفرت پیدا کرانے کی کوشش میں لگے رہے۔ اس کی تائید اڑیسہ کے موجودہ گورنر بی، این، پانڈے کی اس تقریر سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے راجیہ سبھا میں ۲۹ رجولائی ۱۹۷۷ء میں کی تھی، انہوں نے اس میں بتایا کہ ہندوستان میں انگریز مؤرخوں نے جو کتابیں لکھیں ان میں اس پر زیادہ زور دیا کہ ہندو مسلمان کس طرح ایک دوسرے کے خلاف تشدد آمیز رویہ اختیار کیے ہوئے تھے، وہ ایک دوسرے کے علاقے کو فتح کرتے اور لوٹ مار کے ذریعہ مذہبی تعصب دکھاتے، ان تاریخوں میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے کلچر اور روایت کو تہس نہس کرنے میں مشغول رہے، ان کے مندروں اور محلوں کا انہدام کیا، ان کی مورتیاں توڑیں، ان کے سامنے یہ شرط پیش کرتے رہے کہ اسلام قبول کرو، ورنہ تلوار استعمال کی جائے گی۔

جناب بی این پانڈے نے اپنی تقریر میں یہ بھی بتایا کہ برطانوی حکومت کی سرکاری دستاویز سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لارڈ ایلگن کے زمانہ میں سکریٹری آف اسٹیٹ وڈ

نے اس کو ایک خط مورخہ ۳/ مارچ ۱۸۲۲ء میں لکھا کہ ہم لوگوں نے ہندوستان میں اب تک اپنا اقتدار اس طرح قائم کر رکھا ہے کہ ہم ہندو مسلمان کو ایک دوسرے کا مخالف بناتے رہے اس کو جاری رکھنا چاہیے، جہاں تک ممکن ہو اس کی پوری کوشش کرتے رہنا چاہیے کہ یہاں کے لوگوں میں مشترکہ جذبات پیدا نہ ہونے پائیں۔

۹/ مئی ۱۸۴۲ء میں اسی وڈ نے لارڈ ایلکن کو پھر لکھا کہ اس کو یقین جانیں کہ یہاں کے لوگوں کی ایک دوسرے کی دشمنی ہمارے لیے قابل اعتنا ہوگی، اگر پورا ہندوستان ہمارے خلاف متحد ہو جائے تو ہم وہاں کیسے باقی رہ سکتے ہیں۔

۲۹/ مارچ ۱۸۸۶ء میں ایک دوسرے سکریٹری آف اسٹیٹ جارج فرانس ہملٹن نے لارڈ کرزن کو لکھا کہ ہم لوگ ہندوستان کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں، اس طرح کہ دونوں کے خیالات مختلف ہوں، اس لیے تعلیمی اداروں میں نصاب کی کتابیں ایسی پڑھائیں کہ یہاں کے مختلف فرقوں کے درمیان تفرقہ کی مضبوطی پیدا ہوتی رہے۔

۴/ جنوری ۱۸۸۶ء میں اسی سکریٹری آف اسٹیٹ نے لارڈ ڈفرن کو لکھا کہ ہندوستان کے لوگوں میں مذہبی اختلاف پیدا کرنا ہمارے فائدہ کے لیے ہے۔ آپ نے ہندوستان میں تعلیم کے نصاب بنانے کے لیے جو تحقیقاتی کمیٹی بنائی ہے اس سے ہم اچھے نتائج کے متوقع ہیں۔

برطانوی حکومت کی اس سیاسی حکمت عملی کی روشنی میں کارنیگی، ۱۸۷۷ء کے فیض آباد گزیٹیر کے مرتب ڈبلو ڈبلو ہنٹر، نیول اور مسز اے ایس بیورج کی مذکرہ بالا تحریروں کا تجزیہ کرنا چاہیے، ان ہی کیا منحصر ہے، ہندوستان کے آثارِ قدیمہ کے انگریز ماہرین عام مؤرخین ضلع کے گزیٹیر کے مرتبین جب اور جہاں موقع ملا انہوں نے واقعات کو توڑ مروڑ کر کے یا اپنی دانشوری یا اپنی قیاس آرائیوں اور دور از کار تاویلوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش

کی کہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے ہندوؤں پر بڑے مظالم کیے، ان کو برابر خوفناک اذیتیں برداشت کرنا پڑیں، ان دونوں فرقوں میں کسی قسم کی مشترکہ قدریں نہیں ہیں۔

ہندوستان کے تمام لوگ انگریزوں کی فریب کارانہ حکمت عملی کو سمجھنے کے باوجود ان کے دام تزویر میں پھنستے رہے، ان کی سیاسی چالبازیوں سے تو چوکنا ضرور ہوئے، مگر ان کے علمی اور تحقیقی فریب کا جادو ان کے سر سے اترتا گیا، بلکہ ان کے سروں پر چڑھ کر بولتا رہا۔

بابری مسجد کے لیے باضابطہ جاگیریں: ۱۸۸۵ء کے مقدمہ کے فیصلہ کے بعد بابری مسجد پہلے کی طرح برابر مسلمانوں کے قبضہ میں رہی اور اجودھیا کے مسلمانوں کے بیان کے مطابق وہاں پنج وقتہ نمازیں بھی ہوتی رہیں اور جمعہ بھی ہوتا رہا۔ کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کے امام اور مؤذن کے لیے مغلیہ عہد سے ساٹھ روپے سالانہ کی رقمیں مقرر تھیں، جو سرکاری خزانہ سے ملا کرتی تھیں، پھر یہ رقم بڑھا کر تین سو روپے تین آنے، چھ پائی کردی گئی، برطانوی حکومت کے زمانہ میں یہ رقم جاری رہی، پھر بندوبست اول کی رقم کے بجائے دو گاؤں بھون پور اور شولا پور متصل اجودھیا بطور معافی دیے گئے، جن کی آمدنی برابر مسجد کے مصارف پر خرچ ہوتی رہی، چنانچہ رجسٹرڈ زیر دفعہ نمبر ۳۰ میں اس وقت کے متولی جواد حسین ساکن موضع شنوال، ڈاکخانہ درشن نگر، ضلع فیض آباد اور ان کے زیر انتظام جائداد بابری مسجد کی عمارت اور موضع بھون پور اور شولا پور کی آراضی کی تفصیل درج ہے اور پھر سنی وقف ایکٹ ۱۳/ ۱۹۲۰ کے تحت چیف کمشنر وقف بورڈ نے معاینہ کر کے اس کا رجسٹریشن بابری مسجد کی حیثیت سے کیا (بحوالہ رسالہ دارالعلوم دیوبند، مارچ و اپریل ۱۹۸۶ء)

۱۹۳۴ء کا جھگڑا: ۱۹۲۰ء کے بعد کچھ سال ایسے گزرے کہ ہندو مسلمان میں خلافت تحریک اور نان کوآپریشن موومنٹ کے سلسلہ میں بڑا میل ملاپ ہو گیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب دونوں بھائی بن کر ہمیشہ زندگی گزاریں گے اور دونوں واقعی..... ایک ہی قوم ہیں،

مگر کچھ دنوں کے بعد سنگٹھن اور شدھی کی تحریکیں چلیں تو ہندو مسلمان دونوں میں بڑا اختلاف پیدا ہو گیا اور بلوے فسادات جابجا ہونے لگے، اسی سلسلہ میں ۱۹۳۴ء میں بابری مسجد اور جنم استھان کا پھر جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں فرقوں کے درمیان بلوہ ہوا، تو جیسا کہ شروع میں ہوا تھا، اس موقع پر بھی فسادیوں نے بابری مسجد میں گھس کر توڑ پھوڑ کیا، بعض کتبے کو بھی اکھاڑ لے گئے، مسجد کے کچھ حصے کو نقصان بھی پہنچایا مگر حکومت کے خرچ سے اس کی مرمت کر دی گئی اور پھر یوپی مسلم ایکٹ ۱۹۳۶ء کے مطابق یہ مسجد یوپی سنی سنٹرل بورڈ وقف کے ماتحت رجسٹرڈ کر لی گئی، ۲۶؍فروری ۱۹۴۴ء میں وقف کے کمشنر کی جو رپورٹ اس تاریخ کے گورنمنٹ گزٹ میں شائع ہوئی ہے، اس میں بھی یہ مسجد سنی وقف کی دکھائی گئی ہے۔

بابری مسجد کو مندر بنانے کی کوشش: ۱۹۴۹ء تک بابری مسجد کسی اختلاف اور نزاع کے بغیر مسلمانوں کے قبضہ میں رہی لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد جب قومی حکومت قائم ہوئی اور ضرورت اس بات کی تھی کہ قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے، تو اس کے برخلاف ۲۲؍۲۳؍دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی رات کو ہنومان گڑھی کے مہنت ابھے رام اپنے چیلوں کے ساتھ مسجد کی دیوار پھاند کر اس میں گھس گئے اور اس کے درمیانی گنبد میں عین محراب کے اندر رام کی مورتی رکھ دی، اس وقت ماتو پرشاد ایک کانسٹبل وہاں متعین تھا، اس نے تھانہ میں رپورٹ درج کرائی کہ ابھے رام داس، شکل داس، سدرشن داس اور پچاس ساٹھ نامعلوم آدمیوں نے مسجد کے اندر جا کر موتی رکھ دی ہے، جس سے نقص امن کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

مسجد میں تالا: اس رپورٹ پر فیض آباد کے سٹی مجسٹریٹ نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت مسجد اور اس سے ملحق گنج شہیداں کو قرق کر لیا اور پریہ دت رام چیرمین میونسپل بورڈ فیض آباد کو رسیور مقرر کر کے مسجد میں تالا لگا دیا اور فریقین کے نام نوٹس جاری کر دی کہ وہ اپنے اپنے دعویٰ کے سلسلہ میں ثبوت پیش کریں، یہ حکم ۱۶؍جنوری ۱۹۵۰ء کو جاری ہوا مسلمانوں میں

بڑی بے چینی پیدا ہوئی، پورے ملک میں ہندو و مسلمانوں کے تعلقات بہت خراب ہو گئے، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی توجہ اس کی طرف دلائی، یو پی میں اس وقت وزیر اعلیٰ گووند بلبھ پنت تھے، پنڈت جواہر لال نہرو کے حکم سے انہوں نے فیض آباد کے ضلع مجسٹریٹ کو ضروری کارروائی کرنے کی ہدایت دی، اس وقت وہاں ضلع مجسٹریٹ کے. کے نائر تھے، مگر وہ خاطر خواہ کاروائی نہ کر سکے تو ان سے استعفا لے لیا گیا، مگر مورتی مسجد میں رکھی رہی۔ (بحوالہ رسالہ دارالعلوم، مارچ، واپریل، ۱۹۸۶ء)

۱۹۵۰ء کا مقدمہ: اس کے باوجود ۱۶ر جنوری ۱۹۵۰ء میں ہندوؤں کی طرف سے گوپال سنگھ وشارد نے یہ دعویٰ دائر کیا کہ مسجد رام جنم بھومی ہے، ہم یہاں پوجا پاٹ کرتے ہیں، مگر مسلمان اور ضلع کے حکام اس میں رکاوٹ ڈالتے ہیں، اس لیے ہندوؤں کو اس میں پوجا پاٹ کرنے کی باضابطہ اجازت دی جائے۔

شری اکشے برہمچاری کے دو خطوط: ان سارے حالات اور ہندو مسلم کشیدگی، بلوے اور فسادات سے اس زمانہ میں گاندھی جی کے چیلے اکشے برہمچاری کو بڑا دکھ پہنچا تو انہوں نے ۱۷ر جنوری ۱۹۵۰ء کو اس زمانہ کے یوپی کے ہوم منسٹر لال بہادر شاستری کو یہ خط لکھا:

پیارے بھائی!

مجھے افسوس ہے کہ بار بار کوشش کرنے کے باوجود بھی میں آپ کی توجہ اجودھیا کے واقعات کی طرف پوری طرح دلانے میں کامیاب نہ ہو سکا، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہاتما گاندھی کی قربانی کے بعد ہمارے دل میں اپنے فرائض اور نصب العین کے احساس کی جگہ خوف وہراس نے قبضہ کر لیا ہے اور ہم اپنے میں عوام کو راشٹر پتا گاندھی جی کے

اصولوں کی طرف متوجہ کرنے کی ہمت نہیں پاتے ہیں، اجودھیا کا معمولی سا واقعہ ملک کی سیاست میں بڑی اہمیت حاصل کرتا جارہا ہے، ہم معمولی غور وفکر سے اس کو کامیابی کے ساتھ سنبھال سکتے تھے، آج نہ صرف فرقہ پرور جماعتیں اپنے سیاسی اغراض کے لیے فرقہ وارانہ زہر پھیلا رہی ہیں، بلکہ بعض کانگریس کے ذمہ دار لوگ بھی اپنے کو اس کے اثر سے نہ بچا سکے، یہ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اس زہر کو بجھانے کے لیے اور مہاتما گاندھی کے نصب العین کو پھیلانے کے لیے ہم کو اسی راستہ پر چلنا چاہیے جس پر وہ چل رہے تھے، کیوں کہ ہمیں صرف اسی شکل میں کامیابی مل سکتی ہے، اسی وجہ سے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں ۲۶/جنوری ۱۹۵۰ء سے صوبائی کانگریس کمیٹی کے دفتر کے سامنے مرن برت رکھوں گا، میرے مرن برت رکھنے کا مقصد گورنمنٹ کے اوپر کسی قسم کا دباؤ ڈالنا نہیں ہے، بلکہ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مہاتما گاندھی کے پاکیزہ اصولوں کو عوام کے دلوں تک پہنچادوں، امید ہے کہ خدا مجھے اس میں کامیاب کرے گا، اپنیشد ہمیں سبق دیتا ہے کہ ”غصہ پر شانتی سے نفرت پر محبت سے اور جھوٹ پر سچ سے فتح حاصل کرو“۔

آپ کا اکشے برہمچاری

۲۰/فروری ۱۹۵۰ء کو انہوں نے لال بہادر شاہ شاستری کے نام ایک دوسرا خط لکھ جس میں اجودھیا کے مسلمانوں اور بابری مسجد کی حالت پر زیادہ فصاحت کے ساتھ اپنے دکھ کا اظہار کیا، یہ خط حسب ذیل ہے۔

پیارے بھائی!

فرقہ ورانہ جنون کی جو آگ چند لوگوں نے اجودھیا اور فیض آباد میں

بھڑکائی اس کی وجہ سے ملک میں تخریبی خیالات پھیلتے جارہے ہیں، جب میں گورنمنٹ اورذمہ دار لیڈر صاحبان کی توجہ اس موقع کی اہمیت کی طرف نہ کراسکا تو میں باپو کے یوم شہادت یعنی ۳۰رجنوری سے مرن برت رکھنے پر مجبور ہوگیا، یہ برت میں نے چوتھی فروری کو اس وقت توڑا جب کہ آپ نے مجھے یقین دلایا کہ اجودھیا اور فیض آباد کے فرقہ وارانہ فساد کو ختم کرنے کے لیے گورنمنٹ مناسب تدابیر کرے گی اور یہ کہا کہ گورنمنٹ کا ارادہ اس برت کی وجہ سے بہت مضبوط ہوگیا ہے، آپ نے یہ بھی تسلیم کیا کہ مقامی حکام نے فرقہ واریت کی آگ پھیلانے والوں کی ہمت بڑھائی تھی اور یہ کہ ابتدا ہی میں حالات پر بہت آسانی سے قابو پایا جاسکتا تھا، شری بشمبھر دیال ترپاٹھی جیسے لیڈروں کے رویہ اور تقریروں سے گورنمنٹ کے لیے حالات مشکل ہوگئے اور مسئلہ کی پیچیدگیاں اور بڑھ گئیں، آنریبل پنڈت پنتھ نے بھی مجھ سے اپنی گفتگو کے دوران میں ان باتوں کو تسلیم کیا اور کہا کہ یہ ظاہر ہے کہ لوگ اس معاملہ کو سلجھانے میں کم سے کم معاون نہ ہوسکے .... برت عارضی طور پر توڑنے کے بعد میں بیمار ہوگیا اور ابھی حال تک صوبائی کانگریس کمیٹی کے دفتر میں پڑا ہوا تھا، اس وجہ سے کچھ عرصہ تک اس بارہ میں آپ کو تکلیف نہ دے سکا لیکن بدقسمتی سے اور نہایت دکھ کے ساتھ مجھے یہ معلوم ہوا کہ اجودھیا اور فیض آباد کے حالات روز بروز بگڑتے جارہے ہیں، بعض معزز مسلمان اس بنا پر مارے بھی گئے کہ انہوں نے انکار کیا کہ جس کو آج بابری مسجد کہتے ہیں وہ ہمیشہ سے ہندو مندر رہا ہے مسلمانوں کا سماجی بائیکاٹ کرنے کا پروپیگنڈہ برابر

جاری ہے، مسلمان دہشت زدہ ہوتے جارہے ہیں اور اپنے بال بچوں کو اپنے رشتہ داروں کے پاس محفوظ مقامات پر بھیجتے جارہے ہیں، بعض نے ترک وطن بھی کرلیا ہے۔

میرا گھر بھی قفل توڑ کر لوٹ لیا گیا اور چند لوگوں نے اس پر قبضہ کرلیا ہے اور جن لوگوں نے میرے اوپر حملہ کیا ان کی حوصلہ افزائی کے لیے پبلک جلسہ کیا گیا اور اس رات تشدد کو قوت پہنچائی گئی اس بات کا پبلک میں اعلان کیا گیا کہ اگر کوئی ہندو مجھے دیکھنے کے ساتھ ہی نہ مارے گا تو وہ ہندو دھرم کے خلاف گناہ کرے گا، میں ان چیزوں کا تذکرہ اس لیے نہیں کررہا ہوں کہ آپ میری جان کی حفاظت کریں لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ جو دہشت ان تشدد آمیز حرکات کی وجہ سے پیدا ہورہی ہے اس کا جلد از جلد انسداد کیا جائے، یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کانگریس کے ذمہ دار لوگوں نے فرقہ پرستوں کی ان حرکتوں کی اجتماعی اور انفرادی لحاظ سے مخالفت کی تھی اور گورنمنٹ کے سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے انہوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ جلد سے جلد امن بحال ہوجانا چاہیے، جس کی وجہ سے ان کی پبلک میں توہین کی گئی اور ان کو خاموش کردیا گیا۔

مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ اس خط کی تحریر تک میرے علم میں کوئی ایسی بات نہیں آئی کہ جس سے معلوم ہوتا کہ حالات کو بہتر بنانے کے لیے کوئی قدم اٹھایا گیا، اجودھیا میں جو کچھ ہورہا ہے وہ کسی تاریخی یا مذہبی عقیدے کی بنا پر ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد محض سیاسی اغراض کا حصول ہے، اگر ان شدید خطرات کا مقابلہ کرنے کی جدوجہد میں کوئی کمی

کی گئی تو یہ لوگ اور بہت سے پیچیدہ مسئلے اسی قسم کے پیدا کر دیں گے جن سے کانگریس کی قوت کمزور ہو جائے گی اور ان کے مقاصد حل ہو جائیں گے۔

میں اس وقت کمزور ہوں اور میری صحت خراب ہو رہی ہے لہذا اپنی صحت درست کرنے کے لیے تھوڑے عرصہ کے لیے باہر جا رہا ہوں، میں آپ کو بعد میں اطلاع دوں گا کہ میں کہاں ہوں گا۔ میں آخر میں تہہ دل سے امید رکھتا ہوں کہ اس میمورنڈم پر جو میں آپ کے ہاتھوں میں دے رہا ہوں گورنمنٹ فوری اور مؤثر تدابیر اختیار کرے گی، باقی خیریت۔

آپ کا اکشے برہمچاری

(بہ شکریہ الحسنات اسلامی اردو ڈائجسٹ بابری مسجد نمبر)

شری اکشے برہمچاری کا میمورنڈم: شری اکشے برہمچاری کے اس خط کے ساتھ جو میمورنڈم وزیر داخلہ اور حکومت اتر پردیش کو بھیجا وہ اس لائق ہے کہ اسے ذیل میں مکمل نقل کر دیا جائے۔

نقل میمورنڈم: اجودھیا اور فیض آباد کے واقعات اور بابری مسجد کا مسئلہ محض ایک مسجد یا مندر کا مسئلہ یا محض ہندوؤں اور مسلمانوں کا جھگڑا نہ سمجھنا چاہیے، ان جھگڑوں کے پیچھے دراصل وہ رجعت پسندانہ سازش ہے جس کا مقصد کانگریس اور مہاتما گاندھی کے بلند اصولوں کی بیخ کنی ہے اور اس طرح الیکشن میں فرقہ وارانہ اور مذہبی جذبات کو ابھار کر الیکشن جیتنا اور کانگریس گورنمنٹ کو الٹ دینا مقصود ہے، ان سازشوں میں مقامی حکام بھی شریک رہے ہیں، ان تمام باتوں کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ فیض آباد اور اجودھیا میں ایک قسم کی نراجی صورت پھیلی ہوئی ہے، ان رجعت پسندانہ عناصر کا حملہ خود میری ذات پر تین مرتبہ ہو چکا ہے، ایک دفعہ لوگ میرے گھر میں گھس آئے اور مجھ کو مارا اور دوسری مرتبہ مجھ کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے مکان کے سامنے گھیر لیا، پولیس کو اطلاع بھیجی گئی لیکن

انہوں نے ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی، کانگریس کے اور معزز اشخاص کو بھی سرکاری عمال کے سامنے پبلک میں گالیاں دی گئیں اور لوگوں کو مار پیٹ کرنے پر بھی ابھارا گیا لیکن باوجود اس کے جن لوگوں نے یہ سب کیا ان کو حکام میں اور خصوصیت حاصل ہوتی گئی۔

جب گنج شہیداں اور دوسری قبریں جو بابری مسجد کے قریب تھیں، مجموعی طور پر کھودی جارہی تھیں اور ان کی جگہ ایک چبوترہ تیار کیا جارہا تھا، اس کے متعلق چند معزز مسلمانوں کی طرف سے ایک عرضی دفعہ ۱۴۵ تعزیرات ہند کے مطابق دی گئی لیکن حکام نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

آج اجودھیا میں دفعہ ۱۴۴ تعزیرات ہند نافذ کردیا گیا ہے اور مسجد پر دفعہ ۱۴۵ کی رو سے گورنمنٹ نے قبضہ کرلیا ہے لیکن ان احکامات کی برابر خلاف ورزی کی جارہی ہے۔

اسٹار ہوٹل کے واقعہ کی مثال اپنی قسم کی ایک ہی ہے، یہ ہوٹل ایک مسلمان کی ملکیت میں تھا، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس ہوٹل کی عمارت کو زبردستی خالی کرایا اور اسے ایک دوسرے شخص کو دے دیا، جس نے گومتی ہوٹل کے نام سے ایک دوسرا ہوٹل کھول دیا۔

ان باتوں نے ہماری اس لامذہبی جمہوریت اور کانگریس حکومت کے خلاف عوام میں غلط قسم کے خیالات پیدا کردیے ہیں، لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ کانگریس رجعت پسند طاقتوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتی اور اب فرقہ واریت اور مذہبی رجعت پسندی کو اس ملک میں بہت جلدی جلدی غلبہ حاصل ہوجائے گا۔

وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں کی تعداد ملک کی آبادی میں ۸۵ فیصد ہے، وہ جو چاہیں کرسکتے ہیں، قانون کا انحصار ان کی مرضی پر ہے، اس غلط خیال کی وجہ سے جو لوگ اب تک فرقہ وارانہ اور رجعت پسندانہ خیالات کی مخالفت کرتے تھے، اب اس کی موافقت کرنے لگے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ جب یہ ہونا ہی تھا تو ہم کیوں اس خیال کے مخالف رہیں، دوسری

طرف اس حالت کے پیدا کرنے میں کامیابی حاصل ہونے پر رجعت پسندوں نے اپنے میں خود اعتمادی پیدا کرلی ہے اور وہ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ انہیں وہ درجہ حاصل ہوگیا ہے کہ جہاں سے کانگریس اور اس کے اصولوں کو وہ کمزور کر سکتے ہیں، مجھے خوف ہے کہ اس قسم کی باتیں یہ لوگ دوسرے شہروں میں بھی پھیلائیں گے اور اس کے ذریعہ سے وہ حالت پیدا کردیں گے جس میں کانگریس ان کی پیروی کرکے ان ہی لوگوں کا ایک جزو ہو جائے گی اور ہار کر نیست و نابود ہو جائے گی۔

اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں رجعت پسندوں کے حملہ کی مخالفت پوری قوت سے کرنا چاہیے اور اس زہریلے ماحول کو قبل اس کے کہ یہ پوری طور سے پھیلے فنا کر دینا چاہیے، میں اجودھیا کے حالات کو پورے طور سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔

گذشتہ ۱۳ر نومبر ۱۹۴۹ء کو مجھے معلوم ہوا کہ بابری مسجد سے متصل قبروں کو مجموعی طور پر کھودا جارہا ہے، قبریں کھودی جارہی تھیں اور قبرستان کے وسط میں ایک پرانی بنیاد پر جسے مسلمان لوگ قناتی مسجد کہتے ہیں، ایک چبوترہ بنایا جارہا تھا، مسلمانوں پر خوف و ہراس طاری تھا، مسلمانوں سے معلوم ہوا کہ انہوں نے حالت کو سنبھالنے کی نیت سے دفعہ ۱۴۵ تعزیرات ہند کی رو سے ایک درخواست سٹی مجسٹریٹ کو دی تھی، جس میں یہ استدعا کی گئی تھی کہ چوں کہ اس قسم کے افعال سے نقص امن کا اندیشہ ہے، لہذا انہیں روک دیا جائے لیکن اس پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی، میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے تنہائی میں گفتگو کی۔

۱۵ر نومبر ۱۹۴۹ء کی رات کو میرے مکان میں تین آدمیوں نے گھس کر مجھے زدوکوب کیا اور تعجب کی بات ہے کہ جو باتیں میرے اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے درمیان تنہائی میں ہوئی تھیں، انہیں حرف بہ حرف ان لوگوں نے دہرایا اور بعد میں دوسرے لوگوں سے بھی کہا۔

بابری مسجد کے سامنے جہاں قبریں کھودی گئیں تھیں وہاں نو روز تک رامائن کا پاٹھ

ہوتا رہا اور بھوجن بھنڈار بہت دنوں تک ہوتے رہے، بڑی بڑی سبھائیں ہوتی رہیں، ٹانگوں اور موٹروں میں لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعہ سے مشتہر کیا گیا کہ رام چندر جی کی پیدائش کی زمین کو واپس لیا جا رہا ہے، یگیہ ہو رہا ہے، درشن کے لیے میلوں باہر سے لوگ موٹروں میں ہزاروں کی تعداد میں آنے لگے جن میں جوش سے بھرے ہوئے لکچر دیے جاتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ بابری مسجد کو شری رام مندر بنانا ہے۔ مہاتما گاندھی، نیز کانگریس اور کانگریسیوں کو گالیاں دی جاتی تھیں، میرے اور شری سدھیشوری پرشاد صدر سٹی کانگریس کمیٹی فیض آباد کے خلاف بہت زیادہ جوش پھیلایا جاتا تھا اور حملہ کرنے کے لیے للکارا جاتا تھا، اس مضمون کی نوٹسیں تقسیم کی گئی تھیں اور مقامی ہفتہ وار اخبار ''درگت'' میں غلط باتوں کے ذریعہ سے پبلک کے جذبات مشتعل کیے گئے تھے، رامائن کا پاٹھ ہوتے وقت سرکاری حاکموں کی موجودگی میں یہ سب کچھ ہوا تھا، اس کے علاوہ پرانی قبروں اور مسلمانوں کے متبرک مقامات ہٹائے گئے اور ان جگہوں پر شیوجی کی مورتی اور دوسرے ہندو دیوتاؤں نصب کردی گئیں، اس طرح منظم طور پر فرقہ وارانہ زہر پھیلایا گیا، حکام کے رویہ سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، یا تو سرکار کی مرضی سے ہو رہا ہے یا سرکار نے فرقہ پرست طبقہ کے سامنے اپنے کو ڈال دیا ہے۔

۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی صبح کو جس کی شب میں بابری مسجد میں رام چندر جی کی مورتی رکھی گئی تھی، قریب نو بجے مجھے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بتایا کہ انہیں شری بھائی لال کے ذریعہ تقریباً چھ بجے صبح کو معلوم ہوا کہ مسجد میں مورتی رکھ دی گئی ہے، اسے دیکھنے گیا تھا، وہاں سے ابھی لوٹا ہوں۔

یہ بات سوچنے کے قابل ہے کہ مسجد میں جہاں پولس کا پہرہ تھا، ان پہرہ داروں میں کسی کو خبر نہ ہوسکی اور بھائی لال کو اتنے سویرے اطلاع مل گئی اور یہ کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو

اس بات کی جانچ کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی کہ شری بھائی لال کو اتنے سویرے یہ خبر کیسے ملی یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اس قسم کی بہت سی خبروں کا راوی شری بھائی لال کو بتاتے ہیں۔

میں تقریباً بارہ بجے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ہمراہ بابری مسجد میں گیا، جہاں مورتی رکھی ہوئی تھی، تھوڑے سے آدمی مسجد کے پاس جمع تھے، اس وقت آسانی سے مسجد کی حفاظت کی جاسکتی تھی اور مورتی کو ہٹایا جاسکتا تھا لیکن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس کو مناسب نہیں سمجھا، صبح ہی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ سے منادی کی جانے لگی کہ بھگوان ظاہر ہوئے ہیں، ہندو درشن کے لیے چلیں، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ہمراہ جاتے وقت میں نے فیض آباد نیز اجودھیا میں اس اعلان کی جانب ان کی توجہ موڑی، جوش بڑھتا گیا اور نوٹسیں تقسیم کی جانے لگیں، موٹروں میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ درشن کے لیے آنے لگے، مجمع میں پرجوش تقریریں ہوتی تھیں اور کہا جاتا تھا کہ کانگریس ہندو دھرم کو برباد کررہی ہے، پاکستان میں ایک مندر بھی نہیں رہ گیا ہے، پھر اجودھیا میں مسجد اور قبرستان کیوں ہونا چاہیے، ہم لوگوں کو مل کر اجودھیا سے مسلمانوں کا نشان مٹادینا چاہیے، یہ تب ہی ممکن ہے کہ جب کانگریس کا تختہ الٹ دیا جائے، کانگریس کے اکثر لوگ اس خیال کو زیادہ پسند کرتے ہیں لیکن پنڈت جواہر لال جی اور کچھ اور لوگ بھی مسلمانوں کا ساتھ دے رہے ہیں، انہیں ختم کرنا ہوگا، اجودھیا میں اکشے برہمچاری اور سدھیشوری پرشاد کو نہیں رہنے دینا چاہیے، یہ ہندو دھرم کو بڑھنے نہیں دینا چاہتے ہیں، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے قہقہوں کے درمیان یہ نعرے لگائے جارہے تھے، اکشے برہمچاری اور سدھیشوری کا ناش ہو، اکشے اور سدھیشوری کو مار ڈالو، یہ مذہب کے دشمن ہیں، مسلمان ہوگئے ہیں، مسلمانوں کی حفاظت کے لیے کانگریس حکومت پر اثر ڈال رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ، پارلمنٹری سکریٹری گووند سہائے کے ایک بڑے جلسہ میں بھی ان لوگوں

نے پکڑ کر کہا اور مذکورۂ بالا نعرہ لگا کر مجمع کو مشتعل کیا۔

شری وشمبھر دیال ترپاٹھی اور شری رگھوداس وغیرہ جیسے کانگریسی لیڈران بھی اس موقع پر اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے اور انہوں نے اجودھیا کی مسجد والے جلسہ میں رجعت پسندوں کی حرکتوں کی موافقت میں تقریریں کیں، انہوں نے کہا کہ جمہوریت کا مطلب ہی یہ ہے کہ اکثریت جسے پسند کرے وہ ہو، میں دیکھتا ہوں کہ یہاں کے لوگ یہاں مسجد نہیں پسند کرتے، لہذا کوئی اس کو لوٹا نہیں سکتا، اگر گورنمنٹ نے اس معاملہ میں مداخلت کی تو میں استعفا دے دوں گا، میں گورنمنٹ کی طرف سے آیا ہوں اور ذمہ داری کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔

راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ اور ہندو مہاسبھا کے لیڈروں نے جلسوں میں کانگریس حکومت کو دھمکی دی اور کہا کہ یہاں مسجد نہیں ہو سکتی، دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے باوجود سرکاری اجازت کے بغیر ان لوگوں کے بڑے بڑے جلوس نکلتے اور جلسے ہوتے تھے، دفعہ ۱۴۴ کی پابندی صرف مسلمانوں تک ہی محدود تھی، جس کی وجہ سے یہ لوگ بابری مسجد میں نماز پڑھنے سے روک دیے گئے، کئی روز تک اجودھیا میں مسلمانوں کا داخلہ روک دیا گیا لیکن ہندوؤں پر جنہوں نے جوش پھیلانے کے لیے یہ حرکتیں کی تھیں اس دفعہ کا کوئی اثر نہ تھا، باوجودیکہ بابری مسجد پر گورنمنٹ نے حسب دفعہ ۱۴۵ قبضہ کر لیا تھا لیکن اس پر پوجا پاٹ جاری رکھا گیا اور مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے محروم کر دیا گیا۔

اسٹار ہوٹل کا سوال بھی بہت اہم ہے، شری بھائی لال نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اطلاع دی کہ باہر کے کچھ مسلمان آکر اسٹار ہوٹل میں ٹھہرے ہیں، ان کے پاس اسلحہ وغیرہ بھی ہیں، ہوٹل کی تلاشی لی گئی، وہاں کوئی دوسرے اسلحہ نہیں ملے، صرف چار آدمی ملے، ان میں ایک شخص سلطان پور کا باشندہ ہے اور بسکٹ کا کاروبار کرتا ہے، بسکٹ خریدنے فیض آباد آیا تھا، اس کے خلاف دفعہ ۱۰۹ تعزیرات ہند کا مقدمہ چلایا گیا اور ہوٹل کو اسی وقت ڈسٹرکٹ

مجسٹریٹ نے اپنی موجودگی میں بے گناہ ہوٹل کے مالک سے خالی کرالیا، بعد میں وہ ہوٹل کا مکان دوسرے کو دے دیا گیا، اب پتہ چلا ہے کہ وہاں ایک دوسرا ہوٹل گومتی ہوٹل کے نام سے بڑے جشن کے ساتھ کھولا گیا ہے، اس کا افتتاح ڈسٹرکٹ جج نے کیا، اس رسم میں دوسرے حکام نے بھی شرکت کی، اس واقعہ سے مقامی لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ مسلمانوں نے حقیقت میں کوئی بڑی سازش کی تھی اور ساتھ ہی ساتھ ہندو مہاسبھا اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ والوں کو اپنے پرجوش عمل کو صحیح ثابت کرنے کا ایک آلہ مل گیا ہے، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی مذہب پرستی کی ساکھ بڑھ گئی ہے اور یہ چرچا ہونے لگا ہے، کہ مذہب کی رکھشا کے لیے انہوں نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا اور انہوں نے صورت حال کا نہایت ہوشیاری سے مقابلہ کر کے ہندو لیڈروں کی جانیں بچائیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسٹار ہوٹل کا مالک ایک پرانا نیشنلسٹ ہے اور قوم پرستی کے سبب سے پچھلے دنوں الیکشن کے زمانہ میں لیگیوں نے اس کا بائیکاٹ کر دیا تھا اور ہوٹل پر دھرنا دیا تھا، یہ معلوم رہے کہ اس سے پہلے چار فرقہ وارانہ فسادات فیض آباد میں ہو چکے ہیں جن میں مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصانات برداشت کرنے پڑے ہیں لیکن گورنمنٹ کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں کی گئی، گذشتہ بقرعید کے موقع پر جس طرح مسلمانوں کے مکانات لوٹے اور جلائے گئے اور انہیں پیٹا گیا اور عورتوں اور بچوں پر وحشیانہ طریقہ سے حملہ کر کے گھائل کیا گیا، وہ اتفاقی واقعہ نہیں تھا، اس سلسلہ میں ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کے صدر شری راجہ رام مصرا اور سٹی کانگریس کمیٹی کے صدر شری سدھیشوری پرشاد اور ضلع بورڈ کے صدر للّن جی کو گالیاں دی گئیں، ان کے خلاف حملہ کرنے کے لیے لوگوں کو اکسایا گیا، نوٹسیں تقسیم کر کے ان کاموں کو حق بجانب قرار دیا گیا، حکومت کو یہ سب معلوم ہے، لیکن افسوس ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے عدم کارروائی کی وجہ سے شرارت پسند لوگوں کی ہمت بڑھتی گئی اور

مسلمان اپنے آنسو پی کر خاموشی اختیار کرنے کے لیے مجبور ہو گئے، آنریبل ہوم منسٹر نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں گھائل مسلمانوں اور ان کے لٹے ہوئے اور جلے ہوئے مکانوں کو خود آ کر دیکھوں گا لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

آج فیض آباد اور اجودھیا میں مسلمانوں میں بہت زیادہ خوف و ہراس طاری ہے اور ان میں سے بیشتر لوگوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو اپنے رشتہ داروں کے ہاں بھیج دیا ہے اور کچھ لوگ اپنے خاندانوں سمیت ترک وطن کر گئے ہیں، میں نے بہت زیادہ کوشش گورنمنٹ کی توجہ اس طرف مبذول کرنے کی کی، مگر ناکام رہا، اس طرف اس کا پتہ چلا ہے کہ اجودھیا کے مسلمانوں پر یہ دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اعلان کریں کہ بابری مسجد ہندوؤں کا مندر ہے، اس کے لیے دھمکی بھی دی جا رہی ہے، دکان داروں کو دوکان خالی کرنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے، ان سے ترک موالات کرنے کا پروپیگنڈا ہو رہا ہے، کچھ معزز مسلمانوں پر حملہ کر کے انہیں گھائل کیا گیا ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ میرے مکان واقع جانکی گھاٹ اجودھیا کا تالا توڑ کر سب سامان لوٹ لیا گیا ہے، مکان پر قبضہ کر کے کچھ لوگ رہنے لگے ہیں، وہاں جلسوں میں پرچار کیا گیا ہے کہ میں اجودھیا میں داخل نہ ہو سکوں اور جو ہندو مجھے دیکھنے کے بعد مجھ پر حملہ نہ کرے وہ گئو ہتیا کا گنہگار ہو گا وغیرہ، میں اس مسئلہ کو مسجدوں یا مسلمانوں کی حفاظت کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا، بلکہ میرے پیش نظر کانگریس اور مہاتما گاندھی کے وہ بہت بلند اصول ہیں، جن کے لیے ہم اب تک لڑتے رہے ہیں، اگر ہم نے اپنی پوری طاقت سے ان رجعت پسندانہ خیالات کا تدارک نہیں کیا تو کانگریس کا نصب العین ختم ہو جائے گا اور عوام میں رجعت پسند خیالات کا پرچار ہونے لگے گا، میں لیڈروں اور سرکار کا دھیان اجودھیا کی حالت کی طرف موڑ کر یہ التجا کرنا چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد وہاں کی صورت حال کو سنبھالیں

اس طرح فساد پھیلانے والے عناصر اور ان سرکاری حکام کے خلاف جنہوں نے اس میں مدد دی ہے، سخت کارروائی کریں، حملہ کرنے والوں کے خلاف پوری کارروائی کر کے مسلمانوں کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیں کہ وہ ایسے ملک میں ہیں جہاں ان کی جان اور ان کا مال محفوظ ہے، ان کے عبادت خانوں اور متبرک مقاموں کو واپس کر کے ان کے مذہبی جذبات کی حفاظت کریں اور اس طرح ملک میں مہاتما گاندھی کے اصولوں کی تبلیغ کر کے سچے رام راج کو قائم کرنے میں کامیابی حاصل کریں، بابری مسجد کے سلسلہ میں یہ کہنا کہ چوں کہ اس مسجد کی بنا شری رام چندر جنم استھان مندر کو توڑ کر قائم کی گئی ہے، لہذا وہ ہندوؤں کو واپس ملنی چاہیے، یہ ایک تاریخی سوال ہے لیکن تاریخی نقطۂ نظر سے فیصلہ کرنے کے بعد بھی ایسے مقامات کے بارہ میں کیا طرز عمل ہونا چاہیے، ایسا اصولی سوال ہے جس پر بنیادی طور پر غور کرنا ضروری ہے، میں التجا کرتا ہوں کہ ہمارے لیڈر اس بارہ میں کوئی صاف اور مستقل حل مرکزی حیثیت سے نکالیں، ایسے معاملات میں خاموش رہ کر اپنی رضامندی نہ ظاہر کرنی چاہیے۔

مورخہ ۲۰ر فروری ۱۹۵۰ء اکشے برہمچاری ممبر پردیش کانگریس کمیٹی اور سکریٹری ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی فیض آباد۔ (بہ شکریہ الحسنات اسلامی) اردو ڈائجسٹ بابری مسجد نمبر اگست ۱۹۸۶ء۔

فیض آباد کے ایس. پی اور ڈپٹی کمشنر کی رپورٹیں: اکشے برہمچاری کے ان خطوط اور میمورنڈم کے باوجود حکومت نے بابری مسجد کو مسلمانوں کے حوالے کرنے کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا، گوپال سنگھ ویشارد کا مقدمہ جاری رہا اور اس مقدمہ کے سلسلہ میں یکم جون ۱۹۵۰ء کو فیض آباد کے ایس. پی کرپال سنگھ نے جواب دعویٰ داخل کیا، تو اس میں لکھا کہ:

یہ زمانہ قدیم سے بابری مسجد ہے اور اس میں ہمیشہ سے مسلمان نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ ہندوؤں کا اس سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں ہے، (بحوالہ رسالہ دارالعلوم

دیوبند اپریل ۱۹۸۶ء)

یہ کسی مسلم سرکاری عہدے دار کی رپورٹ نہ تھی، بلکہ ایک انصاف پسند غیر مسلم سرکاری ملازم کی تھی، اس کی تائید فیض آباد کے ڈپٹی کمشنر نے بھی کی۔

جے. این. اوگرا ڈپٹی کمشنر فیض آباد کا تحریری بیان: ۲۴/اپریل ۱۹۵۰ء کو فیض آباد کے ڈپٹی کمشنر جے. این. اوگرا نے فیض آباد کے سول جج کی عدالت میں ایک حلف نامہ داخل کیا جس کے مختلف پیراگراف میں یہ بیانات دیے۔

پیرا: ۱۴۔ یہ جائداد نزاعی بابری مسجد کے نام سے مشہور ہے اور لمبے عرصے سے مسجد کے طور پر مسلمان استعمال کرتے ہیں، مسلمان اس میں نماز پڑھتے ہیں، اس کا استعمال رام چندر مندر کی طرح کبھی نہیں کیا گیا۔

پیرا: ۱۵۔ ۲۲/دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں رام چندر کی مورتی کو چوری اور غلط ڈھنگ سے مسجد کے اندر رکھ دیا گیا۔

پیرا: ۱۶۔ اس غلط اور غیر قانونی واقعہ سے مسلمانوں میں کافی بے چینی پیدا ہوگئی ہے اور علاقہ میں نقص امن کا خطرہ پیدا ہوگیا، اس لیے حکام کو امن وامان کی خاطر مداخلت کرنی پڑی۔

پیرا: ۱۷۔ ہندو مسلمان میں کشیدگی پیدا ہوئی تو سٹی مجسٹریٹ گورودت سنگھ نے ۲۳/دسمبر ۱۹۴۹ء کو سیکشن ۱۴۴ نافذ کردیا۔

پیرا: ۱۸۔ اسی تاریخ کو اڈیشنل مجسٹریٹ شری مارکھنڈے سنگھ نے فریقین کو طلب کر کے اپنا اپنا معاملہ پیش کرنے کو کہا۔

پیرا: ۱۹۔ مجسٹریٹ مذکور نے صورت حال کو نازک پا کر آراضی کو قرق کرنے اور فیض آباد اجودھیا کے میونسپل بورڈ کے چیرمین کو ریسیور مقرر کرنے کا حکم دیا اور ان کو اختیار دیا کہ وہ اس کی دیکھ بھال کریں اور اس کے نظم ونسق کے لیے اسکیم پیش کر کے منظوری لیں۔ (بحوالہ مسلم

ایم. ایل. اے میمورنڈم ۶؍فروری ۱۹۸۶ء نیز رسالہ دارالعلوم دیوبند، مارچ واپریل ۱۹۸۶ء)

اس کے بعد فیض آباد کے سول جج کا جو فیصلہ ہوا، وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

سول جج فیض آباد کا ۱۹۵۱ء کا فیصلہ: سول جج فیض آباد مورخہ ۳؍مارچ ۱۹۵۱ء

مقدمہ نمبر ۲ (۱۹۵۰ء) شری گوپال سنگھ ویشارد اپلانٹ بنام ظہور احمد وغیرہ۔ مدعیٰ علیہم۔

حکم

گوپال سنگھ ویشارد نے موجودہ مقدمہ کو ۱۶؍جنوری ۱۹۵۰ء میں درج ذیل دعویٰ اور الزامات کے ساتھ پیش کیا۔

وہ (مدعی) ایک سناتن ہندو ہے اور اجودھیا کا باشندہ ہے، وہ اجودھیا میں جنم بھومی کی شری رام چندر جی کی مورتی کی پوجا ہمیشہ سے کرتا رہا ہے اور وہاں جاتا رہا ہے۔ اسے ۱۴؍جنوری ۱۹۵۰ء کو حکام یعنی مدعیٰ علیہ نمبر ۶ نے بے وجہ بات اور بے بنیاد اشتعال کی بنا پر جنم بھومی میں جانے سے اور وہاں مذکورہ مورتی کی پوجا پاٹ کرنے سے روک دیا، مدعیٰ علیہم سات لغایۃ ۹ جو کہ مدعیٰ علیہ ۶ کے مقامی عہدے دار ہیں، وہ مقامی ہندو عوام پر ناحق دباؤ ڈال رہے ہیں اور اس بات کی ترغیب دے رہے ہیں، کہ وہ جنم بھومی میں داخل ہونے سے احتراز کریں، اس سلسلہ میں ان کی عملی مدد ظہور احمد اور رفقاء کی جانب سے ہو رہی ہے جن سے ان عہدے داروں کی ملی بھگت ہے (حالاں کہ) مدعیٰ علیہ ۶ اور مدعیٰ علیہم سات لغایۃ ۹؍اس کا اختیار نہیں رکھتے ہیں کہ وہ مدعی کے مذہبی معاملات میں مداخلت کریں یا اس کو جنم بھومی میں پوجا کرنے سے روک دیں۔

مدعی کی دادرسی ذیل ہے۔

(الف) یہ قرار دیا جائے کہ وہ جنم بھومی میں شری بھگوان رام چندر اور دوسری مورتیوں کی ملکیت کا حق دار ہے اور بغیر کسی مزاحمت یا دشواری کے وہاں کی مورتیوں کے

درشن کا اختیار رکھتا ہے اور

(ب) ذریعہ دوامی حکم امتناعی، مدعی علیہم کو جنم بھومی سے مذکورہ مورتیوں اور شری بھگوان رام چندر کی مورتی کو ہٹانے سے روکا جائے۔

اس نے الگ درخواست میں ذریعۂ بیان تحریری حلفی مطالبہ کیا کہ مدعا علیہ کے خلاف ایک عارضی حکم امتناعی جاری کیا جائے اور یہ کہ مقدمہ کا فیصلہ ملتوی کیا جائے۔

مدعی علیہم کو نوٹس جاری کیے گئے اور ایک عارضی حکم امتناعی کو منظور کیا گیا، دریں اثنا مدعی علیہم سے لغایۃ ۹ رکو احکام، ۱۶ر جنوری ۱۹۵۰ء ترمیم شدہ ۱۹ر جنوری ۱۹۵۰ء جاری کیے گئے، تاکہ میرے ذریعہ صادر ہوئے یک طرفہ حکم امتناعی مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کی تصریح یا ترمیم ہو سکے اس وجہ سے فریقین کو عبوری حکم امتناعی کے ذریعہ سے اس بات سے روکا گیا کہ وہ متنازعہ جگہ سے مورتیوں کو ہٹائیں یا پوجا وغیرہ کے ذریعہ دخل اندازی کریں، جیسا کہ موجودہ حالت ہے۔

حکم نامہ مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کا حکم اب تک برقرار ہے۔

مدعی علیہم ایک لغایۃ پانچ (۱) ظہور احمد (۲) حاجی پھیکو (۳) محمد فائق (۴) محمد سمیع (۵) محمد (اچھن میاں) نے عبوری حکم امتناعی کے خلاف ۱۳ر فروری ۱۹۵۱ء کو ایک اعتراض داخل کیا جس میں درج ذیل بنیادوں پر اس حکم کے جواز کو چیلنج کیا گیا تھا کہ:

(۱) متنازعہ زمین بابری مسجد کا ایک حصہ ہے، جس کی تعمیر بادشاہ بابر نے کرائی۔

(۲) اور یہ ہمیشہ سے مسلمانوں کے استعمال میں رہی ہے۔

(۳) اور یہ کہ ہندوؤں نے وہاں کبھی پوجا نہیں کی۔

(۴) اور یہ کہ وہاں موجودہ مورتیاں حال ہی میں رکھی گئی ہیں۔

(۵) انہوں نے یہ بھی دلیل دی کہ مقدمہ بوجہ عدم نوٹس زیر دفعہ یو/ایس ۸۰

ضابطہ دیوانی ناقص ہے۔

مدعی علیہم چھ لغایۃ ۹ (۶) اتر پردیش اسٹیٹ (۷) ڈپٹی کمشنر فیض آباد (۸) سٹی مجسٹریٹ فیض آباد (۹) سپرنٹنڈنٹ آف پولیس فیض آباد کی جانب سے ۲۵/مارچ ۱۹۵۰ء تک مزید کوئی اور اعتراض داخل نہیں کیا گیا۔

یہ اعتراضات مورخہ ۱۳/فروری ۱۹۵۰ء بتاریخ ۲/مارچ ۱۹۵۰ء زیر سماعت آئے اور سر اقبال احمد نے منجانب مدعی علیہم ایک لغایۃ پانچ ۵ اپنی فاضلانہ بحث میں عمارت کے مختلف پہلو اور اس کے گردونواح کی طرف اپنی بحث کے استدلال میں توجہ دلائی جن کی تردید منجانب مدعی کی گئی، بایں حالت اجرائے کمیشن کی ضرورت پیش آئی کہ عمارت نزاعی کا نقشہ مرتب ہو، کمیشن کی تقرری کی تاریخ پر، مدعی علیہم نے درخواست گزاری کہ عمارت کی تصویر لی جائے، جو منظور کی گئی، نقشے اور تصویریں باضابطہ تیار کر لی گئیں اور اب وہ ریکارڈ کا حصہ ہیں۔

یہ مقدمہ ۱۷/فروری ۱۹۵۱ء کو دوبارہ سماعت کے لیے زیر بحث آیا، جب کہ ڈسٹرکٹ گورنمنٹ وکیل نے جو کہ مدعی علیہم ۶ تا ۹ کی نمائندگی کرتا ہے، مدعی علیہم ایک لغایۃ پانچ کے اعتراضات و دلائل کو تسلیم کر لیا اور مزید یہ بحث کی کہ مقدمہ بعدم نوٹس زیر دفعہ ۸۰ ضابطہ دیوانی ناقص ہے، اس نے اپنے اعتراض مورخہ ۲۵/اپریل ۱۹۵۰ء پر زور دیا۔

یہ کہنا کافی ہے کہ دفعہ ۸۰ ضابطہ دیوانی والی دلیل لینا مدعی علیہم ایک لغایۃ پانچ کے لیے کھلی نہیں ہے۔

۱۹۴۲ء بمبئی ۳۴۹، مدعی علیہم ۶ لغایۃ ۹ مشہور نظیر بھاگ چند بنام سکریٹری آف اسٹیٹ ۱۹۲۷ء پریوی کونسل ص ۱۷۶ پر استدلال کرتے ہیں، مدعی کی طرف سے اس بات پر شدت سے زیادہ زور دیا گیا ہے کہ بھاگ چند کے مقدمہ کی نظیر کا موجودہ مقدمہ پر اطلاق

نہیں ہوتا، مدعی کی جانب سے یہ بھی کہا گیا کہ اس کی بنیاد کرشنا سواری بنام سید احمد ۱۳۶ ار آئی انڈین کیس سی ص ۷۷۔۷۷ ۱۹۳۲ء اور دوسرے ماقبل کے مقدمات پر ہے۔

اس مرحلہ پر فیصلہ صادر کرنا بے شبہہ ایک نزاعی امر ہے، لہذا اس مرحلہ پر یہ فیصلہ کرنا قبل از وقت ہوگا، کہ مقدمہ عدم نوٹس زیر دفعہ ۸۰ ضابطہ دیوانی کی بنا پر لائق اخراج ہے۔

ان کارروائیوں کی خاطر یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا مدعی کے پاس کوئی زیادہ واضح سوال ہے، جو مطلوب حق کے وجود کے بارہ میں اٹھایا جاسکے یا پھر حکم امتناعی کے اٹھالینے کی صورت میں یہ خطرہ تو نہیں کہ وہ اس حق کو کھودے یا انجام کار وہ کوئی ناقابل تلافی زحمت یا تکلیف یا نقصان میں مبتلا تو نہیں ہو رہا ہے۔

ہر لحاظ سے یہ تسلیم ہے کہ زیر بحث معاملہ میں مقدمہ قائم ہونے سے پہلے متنازعہ زمین پر مورتیاں قائم تھیں۔

علاوہ ازیں اجودھیا کے کئی مسلمانوں کے تحریری بیانوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم ۱۹۳۶ء سے مسلمانوں نے اس جگہ کو بطور مسجد استعمال نہیں کیا ہے اور نہ وہاں نماز ادا کی ہے اور یہ کہ ہندو وہاں پوجا وغیرہ کرتے رہے ہیں۔

کوئی ایسی چیز بھی نہیں ہے جس سے ان تحریری بیانات کے متعلق بدگمانی کی جائے، البتہ متنازعہ زمین پر مورتیوں کے وجود سے یہ واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ مدعی کو مقدمہ دائر کرنے کے لیے ایک واضح جواز دستیاب ہے۔

مدعی علیہم ایک لغایۃ پانچ ان متعدد دستاویزوں پر استدلال کرتے ہیں، جو ظاہر کرتی ہیں کہ متنازعہ زمین ہمیشہ سے مسجد رہی ہے۔

اس مرحلہ پر یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی بھی فیصلہ صادر کیا جائے کیوں کہ اس کا فیصلہ اس وقت ہی ہوگا جب کہ فریقین کی جانب سے مہیا کردہ تمام زبانی اور تحریری شہادتوں پر غور کرلیا جائے۔

غیر متنازعہ حقیقت یہ رہ جاتی ہے کہ اس مقدمہ کی تاریخ کے وقت سری بھگوان رام چندر کی مورتی اور دوسری مورتیاں اس جگہ پر قائم ہیں اور ہندو اور مدعی ان کی پوجا کرتے رہے ہیں، گو اس راہ میں انتظامی حکام کی جانب سے کچھ بندشیں عائد رہی ہیں۔

فریقین کے مذکورہ بالا بیانات مدعی کے لیے بادی النظر میں مقدمہ ضرور بناتے ہیں، جہاں تک توازن سہولت کا تعلق ہے، یہ واضح ہے کہ حکم امتناعی عارضی کو اس مرحلہ پر خارج کرنے سے مدعی کو اس حق سے جس کو اس نے اپنے مقدمہ میں مانگا ہے، محروم کرنا ہوگا، مزید برآں یہ درمیان فریقین تسلیم شدہ معاملہ ہے کہ اس محلہ میں کئی دوسری مسجدیں ہیں، اس لیے اگر مقدمہ کے زیر سماعت رہنے تک حکم امتناعی بدستور جاری رہے تو مقامی مسلمانوں کے لیے نماز ادا کرنے میں زیادہ زحمت پیدا نہ ہوگی۔

ان اسباب کی بنا پر میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ موجودہ حالت بدستور جاری رہے۔

حکم

عبوری حکم امتناعی مورخہ ۱۶/ جنوری ۱۹۵۰ء جس میں ترمیم شدہ مورخہ ۱۹/ جنوری ۱۹۵۰ء میں ترمیم کی گئی تھی، وہ تا فیصلہ مقدمہٗ ہذا نافذ رہے گا۔

اس فیصلہ کا اردو ترجمہ اس متن سے کیا گیا جو مسلم انڈیا انگریزی میں مارچ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔

تبصرہ: پہلے ذکر آیا ہے کہ اس مسجد میں ۱۹۴۹ء میں تالا اس لیے لگا دیا گیا کہ ۲۲/۲۳/ دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی رات میں مہنت ابھے رام نے اپنے چیلوں سمیت مسجد میں گھس کر مورتیاں رکھ دیں جس کے خلاف ماتو پرشاد کانسٹبل نے رپورٹ درج کی، پھر اس کا بھی ذکر آچکا ہے کہ اس رپورٹ کی بنیاد پر فیض آباد کے سٹی مجسٹریٹ نے نقض امن کی خاطر مسجد کو قرق کر لیا اور ایک ریسیور مقرر کر دیا کہ وہ دیکھ بھال کرے کہ اس مقدمہ کے فیصلہ ہونے

تک نہ وہاں پوجا ہو اور نہ وہاں نماز پڑھی جائے اور یہ بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ مذکورۂ بالا مقدمہ سے پہلے فیض آباد کے ڈپٹی کمشنر جے. این. اوگرا اور ایس. پی کرپال سنگھ نے ۱۹۵۰ء میں جو بیانات دیے، ان میں یہ تسلیم کیا کہ یہ بابری مسجد ہے، اس میں ہمیشہ سے مسلمان نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں، ہندوؤں کا اس سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں رہا ہے لیکن فاضل جج نے ان سرکاری بیانات کو نظر انداز کر دیا اور اپنے فیصلہ میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اس میں پوجا ہوتی رہی ہے، اس لیے کہ وہاں مورتیاں موجود ہیں، مورتیاں تو وہاں زبردستی رکھ دی گئی تھیں، فاضل جج نے اس کی طرف بھی اشارہ نہیں کیا اور چوں کہ وہاں مورتیاں موجود تھیں، اس لیے یہ خیال کیا گیا کہ وہاں پوجا بھی ہوتی رہی ہوگی، حالاں کہ حکومت کی طرف سے جو تالا لگایا گیا تھا، اس سے ظاہر ہے کہ یہ حکم تھا کہ وہاں نہ پوجا ہو اور نہ نماز پڑھی جائے، جب تک کہ اس کا کوئی قطعی فیصلہ نہ ہوجائے لیکن فاضل جج نے ان باتوں کو نظر انداز کر دیا۔

مگر فاضل جج کا یہ فیصلہ یوں غنیمت رہا کہ انھوں نے ۱۶/جنوری ۱۹۵۰ء کے امتناعی حکم کو برقرار رکھا، یعنی وہاں سے نہ مورتیاں ہٹائی جائیں گی اور نہ وہاں ان کی پوجا ہوگی۔

۱۹۶۰ء کا فیض آباد گزیٹیر: ۱۹۶۰ء میں فیض آباد کا گزیٹیر ایک خاتون مسز ایشا بسنتی جوشی آئی. اے. ایس کی نگرانی میں مرتب ہوا، خیال تھا کہ قومی حکومت کے زمانے میں جو گزیٹیر تیار ہوگا، اس کا انداز اور لب ولہجہ ان گزیٹیروں سے مختلف ہوگا جو انگریزوں کے زمانے میں تیار ہوئے تھے، مگر انگریزوں کا جادو سر پر چڑھ کر بولتا رہا اور ۱۹۶۰ء کے فیض آباد گزیٹیر میں بابری مسجد اور جنم استھان کی وہی روایتیں دہرائی گئیں جو پہلے کے گزیٹیر میں تھیں، گو جزوی ترمیم کرکے اس کو نیا بنانے کی کوشش کی گئی ہے، پھر بھی ان کو سامنے رکھ کر پڑھا جائے گا تو گذشتہ گزیٹیر کی سطروں کی سطریں اس میں بجنسہٖ نقل کر دی گئی ہیں، اس کے باب دوم، تاریخ کے ص ۴۷ پر یہ لکھا گیا ہے۔

وہ موخرالذکر (بابر) اودھ پہنچا تو بایزید اپنے خاندان کے ساتھ غازی پور فرار ہوگیا، بابر خود اودھ (اجودھیا) آیا اور یہاں چند دنوں تک ٹھہرا۔ (بحوالہ بابر نامہ اے. ایس. بیورج صفحہ ۶۰۱۔۶۰۲) یہاں کے باغوں، جھرنوں، خوش وضع عمارتوں اور درختوں خصوصاً آم کے پیڑوں اور رنگین کلغی دار پرندوں کو دیکھ کر متاثر ہوا (بابر نامہ صفحہ ۶۸۰) اس نے اودھ کا گورنر باقی تاشکندی کو مقرر کیا، جس نے مقامی باغی سرداروں کی سرکوبی کی (بابر نامہ صفحہ ۶۷۹، صفحہ ۸۵۔۶۸۴) اس کے عہد حکومت میں باقی نے ۱۵۲۸ء میں اجودھیا میں ایک مسجد بنائی، مسجد کے اندر جو کتبہ ہے، اسی کی آخری سطر میں اس عبارت کی تعمیر کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ (بابر نامہ XXVII-VIII) اور وہ یہ ہے، گزیٹر میں ان اشعار کے صرف مطلب لکھ دیے گئے ہیں۔

بفرمودۂ شاہ بابر کہ عدلش — بنائست باکاخِ گردوں ملاقی
بناکردہ ایں مہبطِ قدسیان را — امیر سعادت نشاں میر باقی
بود خیر باقی وسال بنائش — عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی

۹۳۵ھ

اور پھر صفحہ ۶۴۔۶۳ پر یہ عبارت ہے۔

"۱۸۵۵ء میں بیراگیوں اور مسلمانوں میں بڑا سخت تصادم اجودھیا کے ہنومان گڑھی کی جائے وقوع کے لیے ہوا۔ دونوں کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ ان کے مذہب کی عبادت گاہ ہے، واجد علی شاہ کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اس معاملہ کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی، اس کے لیے گلاب باڑی میں ایک عام جلسہ ہوا، وہاں جو لوگ جمع ہوئے، ان میں سے کسی نے یہ بیان نہیں دیا کہ یہاں ایک مسجد تھی اس لیے کمیٹی نے بیراگیوں کے حق میں فیصلہ دیا، جب کمیٹی کے اس فیصلے کی خبر لکھنؤ پہنچی تو وہاں مسلمانوں میں بڑا ہیجان

پیدا ہوا ایک مجلس عمل بنائی گئی، جس کے رہنما امیٹھی (ضلع لکھنؤ) کے امیر علی بنائے گئے، وہ سوہالی میں مقیم تھے، ان کے اردگرد بہت سے ان کے مقلد جمع ہو گئے، بیراگیوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے اپنی مدافعت کی تیاری کی، واجد علی شاہ نے اپنی فوج کے ایک دستہ کو اس کی حفاظت کے لیے حکم دیا، بالآخر ۷ر نومبر ۱۸۵۵ء کو امیر علی رودولی کے لیے روانہ ہوئے، ان کے ساتھ ان کے پیرو تھے، کپتان بارلو نے ان کو واپس جانے کا حکم دیا لیکن انہوں نے انکار کیا، تو ایک جنگ چھڑ گئی جس کے بعد وہ اور ان کے ساتھی مارے گئے، (بحوالہ قیصر التواریخ یا تاریخ اودھ از کمال الدین حیدر جلد ۲ صفحہ ۱۲۸-۱۱۰ حدیقۂ شہداء ۱۸۵۵ء، لکھنؤ)

باب ۱۹ میں صفحہ ۳۵۲ پر دلچسپ مقامات کے عنوان کے تحت یہ عبارت ہے:

''اجودھیا نمایاں طور پر مندروں کا ایک شہر ہے لیکن اس کی ساری عبادت گاہیں صرف ہندو مذہب ہی سے وابستہ نہیں ہیں، یہاں جینیوں کے بھی مندر ہیں، مسلمانوں کی بھی مسجدیں اور مقبرے ہیں، یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات کے زمانے میں ہندوؤں کے تین اہم مندر تھے اور کچھ چھوٹے مندر بھی تھے اور یہ جنم استھان مندر تھا، سورگ دوار تھا اور ترتیا کا ٹھاکر تھا، جنم استھان رام چندر کے پیدا ہونے کی جگہ تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب بابر ۱۵۲۸ء میں اجودھیا آیا تو اس کے حکم سے یہ پرانا مندر منہدم کر دیا گیا اور اس کی جگہ پر وہ مسجد بنی جو بابری مسجد کہلائی، پرانے مندر کا سامان اس مسجد میں لگایا گیا اور اس کے بعض ستون اب تک اچھی حالت میں ہیں، وہ (Close Grained) کالے پتھر (کسوٹی) ہیں، ان میں ہندوؤں کے کئی (Base belief) بھی ہیں، اس اصلی عمارت کی بیرونی شہتیر صندل کی لکڑی کی ہے، ستون

کی اونچائی ۷ یا ۸ فٹ ہے، نیچے، بیچ اور کیپٹل کا حصہ چوکور ہے، بقیہ یا تو مدور یا ہشت پہل ہیں اس میں دو کتبے فارسی میں ہیں، ایک تو باہر ہے اور دوسرا منبر کے پاس ہے، جس میں ۹۳۵ھ لکھی ہوئی ہے، اس کے بعد اورنگ زیب نے بھی اجودھیا کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی، جس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں طویل تلخی رہی''۔ دونوں طرف سے حملے اور جوابی حملے ہوتے رہے، اس کی انتہا ۱۸۵۵ء میں مولوی امیر علی کی قیادت میں پہنچ گئی۔ اس کے نتیجہ میں ۱۸۵۸ء میں مسجد کے سامنے ایک بیرونی احاطہ کر دیا گیا، ہندوؤں کو اندر جانے کی ممانعت ہوگئی اور ان کو اس کے باہر ایک چبوترہ پر پوجا کرنے کو کہا گیا۔ ۱۹۴۹ء کے بعد یہ صورت حال بدل گئی ہے، ہندو اس مسجد میں رام اور سیتا کی مورتیاں رکھنے میں کامیاب ہوگئے ہیں، اس کی وجہ سے اس جگہ کے لیے بڑی مقدمہ بازیاں ہو رہی ہیں، اس وقت اندرونی حصہ کی حفاظت ایک مسلح گارڈ کے ذریعہ سے کی جاتی ہے اور چند ہندو پوجاریوں کو اس کے اندر جانے کی اجازت ہے۔

تبصرہ: اس گزیٹر کے بیانات میں بابر کا اودھ میں آنے، وہاں کے مناظر سے متاثر ہونے، امراء کی بغاوت کے کچلنے اور بابری مسجد کی تعمیر ہونے کی تاریخ کے حوالے مسز اے. ایس. بیورج کی بابر نامہ سے دیے گئے ہیں، اسی طرح مولوی امیر علی کی جنگی مہم کے سلسلہ میں قیصر التواریخ تاریخ اودھ اور حدیقہ شہداء کے حوالے ہیں لیکن جب ایسے اہم بیانات قلم بند کیے گئے ہیں کہ بابر نے جنم استھان کے پرانے مندر کو منہدم کیا اور اورنگ زیب نے اجودھیا کے مندروں کی بے حرمتی کی تو ان کے لیے کسی تاریخ کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے، پھر

بیانات کیسے قابل قبول ہو سکتے ہیں، صحیح بات تو یہ ہے کہ اس گزیٹیر میں پرانے گزیٹیروں کی باتیں نقل کر دی گئی ہیں اور بہت سے جملے تو ہو بہو ان ہی کے ہیں، مرتب کو یہ خیال رہا ہوگا کہ تاریخی واقعہ کی سند کے لیے کسی گزیٹیر کا حوالہ قابل قبول نہیں ہوتا، اس لیے اس میں اس کا حوالہ دینا مناسب نہیں سمجھا گیا، پھر ان بیانات میں جو تضاد پیدا ہو گیا ہے، ان کو قلم بند کرتے وقت خیال نہیں رکھا گیا، پہلے تو یہ کہا گیا کہ بابر کے عہد حکومت میں باقی نے ۱۵۲۸ء میں اجودھیا میں ایک مسجد بنائی، اس کی سند میں کتبہ کے اشعار کے معنی پیش کیے گئے ہیں لیکن آگے چل کر یہ لکھا گیا ہے کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے" کہ ۱۵۲۸ء میں بابر اجودھیا آیا اور اس کے حکم سے پرانا مندر (یعنی جنم استھان) مسمار کر دیا گیا، اس کے جائے وقوع پر وہ مسجد بنی جو بابری مسجد کہلائی، مرتب کو اپنے بیان پر یقین نہ تھا، تو اور نہ ہونا چاہیے تھا، اس لیے کہ اس کی سند فراہم نہیں ہو سکتی ہے، اسی لیے "ایسا معلوم ہوتا ہے" لکھ کر بیان قلم بند کیا گیا ہے جس کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی ہے، پھر اس میں یہ بھی بیان ہے کہ اورنگ زیب نے بھی اجودھیا کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی، جس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں طویل تلخی رہی، اس بیان میں اس کی وضاحت نہیں ہے کہ کون سی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی گئی، مگر اس میں جب یہ لکھا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے طویل تلخی رہی اور اس تلخی کا ذکر ہنومان گڑھی کے سلسلہ میں ہندو و مسلمان کے شدید تصادم کی حیثیت سے کیا گیا ہے تو اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے ہنومان گڑھی ہی میں کسی مندر کو توڑ کر مسجد بنائی، مگر مرتب کا یہ بھی بیان ہے کہ اس جھگڑے کے سلسلہ میں واجد علی شاہ نے تحقیقات کی جو کمیٹی مقرر کی اور اس کے لیے گلاب باڑی میں جو ایک عام جلسہ ہوا اور وہاں جو لوگ جمع ہوئے ان کا یہ بیان ہوا کہ وہاں کوئی مسجد نہ تھی، اس سے تو اورنگ زیب پر سے یہ الزام خود بخود جاتا رہتا ہے کہ اس نے ہنومان گڑھی کے مندر کو توڑ کر وہاں ایک مسجد بنوائی، مگر یہ صحیح نہیں کہ

ہنومان گڑھی میں مسجد نہ تھی اس کا ذکر ہم پہلے حدیقۂ شہدا اور قیصر التواریخ کی روشنی میں کر چکے ہیں، مسلمانوں کا جو قتل عام انگریزوں کی وجہ سے ہوا، اس کی پوری تفصیل ان دونوں کتابوں میں ہے جس کو گزیٹیر کے مرتب نے نظر انداز کر دیا ہے، گو بارلو کا ہلکا ذکر کر دیا ہے اگر اس میں اس کی تفصیل لکھ دی جاتی تو بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے تنازع کی نوعیت کا پورا اندازہ ہو جاتا۔

یوپی سنی سنٹرل وقف بورڈ کی طرف سے مقدمہ ۱۹۶۱ء : شری گوپال سنگھ وشارد کے مقدمہ کے علاوہ دو اور مقدمے دائر کیے گئے، ایک پریم ہنس، رام چندر داس اور ایک نرموہی اکھاڑے کی طرف سے ان کے جواب میں یو. پی سنی سنٹرل وقف بورڈ کی جانب سے بھی مقدمہ دائر ہوا اور مسجد کی واپسی کا دعویٰ کیا گیا، یہاں تک کہ تمام مقدموں کی فائلیں الگ الگ تھیں، عدالت کی سہولت کی خاطر اس کے حکم سے ان کو یکجا کر دیا گیا اور سی سنٹرل وقف بورڈ کے مقدمہ ۶۱/۱۲ کو رہنما کیس قرار دیا گیا۔

مسجد میں تبدیلیاں: اس اثناء میں پریہ دت ریسیور کا انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ پر کے. کے. رام ورما کو آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا گیا، مگر ان کے ریسیوری کے زمانہ میں ہندوؤں نے مسجد میں تبدیلی شروع کر دی تو مسلمانوں کی درخواست پر ان کو ہٹا دینے کا حکم دیا گیا ہندو اس کے خلاف لکھنؤ ہائی کورٹ سے اسٹے آرڈر لے آئے، اس سلسلہ میں مقدمات کی جملہ فائلیں ہائی کروٹ میں طلب کی کر لی گئیں، جس کے بعد فیض آباد میں تمام مقدمات رک گئے، ہائی کورٹ کی طرف سے بھی اس سلسلہ میں مقدمہ کی کوئی سماعت نہیں ہو سکی۔

بابری مسجد میں غیر قانونی تبدیلیاں: ۱۸۸۵ء کے مقدمہ کے سلسلہ میں ذکر آیا ہے کہ مسجد کے صدر دروازہ پر ''اللہ'' کندہ تھا، مگر ریسیور کے ہونے کے باوجود اس کو کھرچ کر مٹا دیا گیا اور دروازہ پر جنم استھان مندر کا بورڈ لگا دیا گیا، پھر احاطہ کی شمالی چہار دیواری اور

مسجد کی درمیانی خالی جگہ پر سفید اور سیاہ سنگ مرمر کا فرش بنادیا گیا اور اس کا نام پری کرما رکھا گیا، (یعنی طواف کی جگہ) مسجد کے صحن میں اتر طرف ایک ہینڈ پائپ بھی لگادیا گیا اور پھر مسجد سے باہر پورب کی طرف ایک مندر بنالیا گیا، اسی کے پاس مہنتوں کے لیے رہنے کی جگہ بھی بنائی گئی، دکھن کی طرف جنم استھان کے چبوترہ پر ایک مندر تعمیر کرلیا گیا ہے اور اسی کے آس پاس دو مندر اور بھی بنالیے گئے، مسجد کے درمیانی گنبد پر ایک جھنڈا لگادیا گیا، یہ ساری تبدیلیاں ۱۹۶۷ء سے برابر ہوتی رہیں اور ریسیور کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی۔ (رسالہ دارالعلوم دیوبند، مارچ واپریل ۱۹۸۶ء)

رمیش چندر پانڈے کی درخواست: ۲۵ر جنوری ۱۹۸۶ء میں رمیش چندر پانڈے نے فیض آباد کے صدر منصف کے یہاں ایک درخواست دی کہ مسجد کا تالا کھول دیا جائے تاکہ ہندو وہاں جاکر پوجاپاٹ کرسکیں، مگر منصف صدر نے یہ کہہ کر درخوسات رد کردی کہ اس مقدمہ کی رہنما فائل ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے، اس لیے اس درخواست پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

فیض آباد کے ڈسٹرکٹ جج کے یہاں اپیل: اس فیصلہ کے خلاف فیض آباد کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر کے. ایم. پانڈے کی عدالت میں اپیل کی گئی، انہوں نے یکم فروری ۱۹۸۶ء کو یہ فیصلہ سنایا کہ ضلع انتظامیہ اس مسجد کا تالا کھول دے اور ہندوؤں کو وہاں پوجاپاٹ کرنے کی اجازی دے دی جائے، ان کے فیصلہ کا متن ذیل میں درج ہے:

شری کے. ایم. پانڈے ڈسٹرکٹ جج فیض آباد کا فیصلہ، یکم فروری ۱۹۸۶ء:

رمیش چندر پانڈے مدعی بنام اسٹیٹ آف اتر پردیش، اور ۳۰ دوسرے مدعی علیہم یہ اپیل اس حکم کے خلاف ہے، جسے ہری شنکر دوبے منصف صدر فیض آباد نے مستقل مقدمہ نمبر ۲/۵۰ کے سلسلہ میں ۲۸ر جنوری ۱۹۸۶ء کو صادر کیا تھا۔

مقدمہ کے حقائق مختصر طور پر اس طرح ہیں کہ مقدمہ ۲، ایف اے ۵/ میں مدعی نے ایک درخواست (۴۲۲ سی) اس مطلب کی گذاری کہ مدعی اور ہندو قوم کے دیگر افراد ام طور سے شری بھگوان رام چندر جی کی مورتی کی پوجا اور درشن کرتے ہیں، اس کے علاوہ ہ ان مورتیوں کی بھی پوجا کرتے ہیں، جو اس مقدمہ کی اراضی سے متعلق ہیں، تو مدعا علیہم ۶ تا ۹ کو یہ ہدایت کی جانی چاہیے کہ وہ مذکورہ جگہ کے داخلہ کے دروازہ کو بند کر کے یا وہاں تالا بندی کر کے اس پوجا اور درشن میں کسی قسم کی پابندی یا رکاوٹ نہ پیدا کریں۔

مدعا علیہم ۶ تا ۹ اتر پردیش اسٹیٹ، ڈپٹی کمشنر فیض آباد، سٹی مجسٹریٹ اور ایس. پی ہیں، ان لوگوں نے یہ اعتراض نامہ داخل کیا کہ وہ عدالت کے حکم مورخہ ۳/ مارچ ۱۹۵۱ء کے مطابق مذکورہ مورتیوں کی پوجا میں مداخلت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں، وہ صرف اس بنیاد پر درخواست کے مزاحم ہیں کہ نظم و ضبط کی برقراری کے سلسلہ میں ضروری اقدامات اٹھانے کے لیے ان کو اختیار دیا گیا ہے اور ان کے اس حق کو کسی بھی طور پر ختم نہیں کیا جا سکتا، فاضل منصف نے درخواست دہندہ کو اس کی درخواست پر کسی قسم کی دادرسی نہیں کی، حتیٰ کہ اس معاملہ میں کوئی حکم ہی نہیں صادر کیا، کیوں کہ ۱۹۶۱ء کے رہنما مقدمہ نمبر ۱۲ کا ریکارڈ ہائی کورٹ کے پیش نظر ہے، اسی لیے فاضل منصف نے خود کو اس لائق نہیں پایا کہ وہ اس درخواست پر کوئی فیصلہ دے، اس کی خاص بنیاد یہ ہے کہ کوئی بھی حکم جو اس معاملہ میں صادر کیا جائے گا، وہ رہنما مقدمہ کی فائل میں بھی جاری کیا جائے گا اور چوں کہ رہنما مقدمات کی فائل دستیاب نہیں ہے، اس لیے فاضل منصف نے کوئی حکم جاری نہیں کیا۔

یہ بات درخواست کی نامنظوری کے مترادف ہے، لہٰذا مدعی نے موجودہ درخواست کو پیش کیا، مدعی نے اس درخواست میں صرف مقدمہ نمبر ۲/ ۱۹۵۰ء کے مدعا علیہم ۶ تا ۹ کو بحیثیت مخالف پارٹی کے اپنا فریق بنایا ہے۔

مدعی کہتا ہے کہ اس کو دوسرے مدعا علیہم سے کوئی شکوہ نہیں، اس لیے وہ ان لوگوں کو اپنا مخالف اور محاذی نہیں بنانا چاہتا۔

اس مقدمہ میں حکم امتناعی کا جو آخری حکم نافذ کیا گیا، وہ ۳رمئی ۱۹۵۱ء کا ہے، اس حکم کے مطابق سول جج نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ حکم امتناعی مورخہ ۱۶رجنوری ۱۹۵۰ء ترمیم شدہ ۱۹رجنوری ۱۹۵۰ء نافذ رہے گا۔

۱۹رجنوری ۱۹۵۰ء کو فاضل عدالت نے اس مفہوم کا حکم امتناعی جاری کیا کہ ''فریقین کو حکم امتناعی کے ذریعہ بہر طور اس بات سے روکا جائے گا کہ وہ متنازعہ زمین کی مورتیوں کو ہٹائیں، یا پوجا کے ذریعہ مداخلت کریں، وغیرہ وغیرہ جیسا کہ اس وقت معمول ہے''۔

فاضل عدالت کا یہ فیصلہ آج تک قائم ہے اور مقدمہ نمبر ۲/۱۹۵۰ء میں حکم امتناعی کے اس فیصلہ کی ہائی کورٹ نے بھی توثیق کر دی ہے۔

موجودہ درخواست میں صرف یہ نکتہ قابل غور ہے کہ آیا مدعی علیہم کو تالا ہٹانے کی ہدایت دی جا سکتی ہے؟ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پوجا کرنے اور پجاریوں کی آزادانہ آمدورفت میں وہی خاص رکاوٹ ہے۔

میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس. ایس. پی فیض آباد کو اس معاملہ میں نوٹس جاری کیے، یہ دونوں میرے سامنے عدالت میں پیش ہوئے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بیان دیا کہ متنازعہ جگہ پر ایستادہ مورتیاں باہر سے دیکھی جا سکتی ہیں، بیرونی پھاٹک میں پلے نہیں ہیں، خاص پھاٹک میں ایک سلاخوں والا جنگلہ ہے اور دو دروازے اندرونی احاطہ میں ہیں۔ ۱۹۵۰ء کے مقدمہ نمبر ۲ کے نقشہ نظری پیپر نمبر ۱۳۶/۵ میں ان دروازوں کو حروف 'پی' اور 'او' کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے، ان دونوں پھاٹکوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔

ان کو (ڈپٹی مجسٹریٹ) یہ علم نہیں ہے کہ یہ تالے کب لگائے گئے اور کس نے ان کو لگانے کا حکم دیا تھا، اس معاملہ کا کوئی ریکارڈ بھی دستیاب نہیں ہے کہ کس نے 'او' اور 'پی' پھاٹکوں پر تالے ڈالنے کا حکم صادر کیا۔

پجاری کو پوجا کرنے اور بھوگ کرنے کے لیے پھاٹک 'او' سے اندر جانے کی اجازت ہے، پھاٹک 'او' کا تالا نہیں کھلا ہے، نقشہ میں جو مورتیاں دکھائی گئی ہیں، ان کے علاوہ اندر کے حصہ میں اور بھی مورتیاں ہیں، جب وہاں پوجا کی جاتی ہے تو ان مورتیوں میں سے اکثر کو باہر سے دیکھا جا سکتا ہے۔

مہنت کے علاوہ دوسرے افراد بھی سٹی مجسٹریٹ کی اجازت سے مذکورہ جگہ جا سکتے ہیں۔

گذشتہ ۳۵ یا ۳۶ سال سے دوسرے فرقہ کے کسی بھی شخص نے وہاں نماز نہیں ادا کی ہے، ان کو اس جگہ جانے کی اجازت بھی نہیں ہے، نقشہ کی لائن (ایچ اور جے) کے باہری جانب مورتیاں ہیں اور بیرونی دیوار کے اندرون میں چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں اور پوجا کی جاتی ہے، اس مقام پر ۱۹۵۱ء سے اب تک نظم وضبط کا کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوا نہ ہی کوئی فساد ہوا، پھاٹک 'او' اور 'پی' پر تالے صرف اس لیے پڑے ہیں کہ اندر رکھی ہوئی مورتیوں کی دیکھ بھال ہو سکے، کہ وہ کہیں غائب تو نہیں کر دی گئی ہیں اور یہ تالے بھی عدالت کے حکم امتناعی کے احترام کے طور پر لگے ہیں۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مزید کہتے ہیں کہ مورتیوں کی حفاظت کے لیے پھاٹک 'او' اور پھاٹک 'پی' کو بند رکھنے کے علاوہ مورتیوں کی حفاظت اور نظم وضبط کی برقراری کے لیے دوسرے اور طریقے بھی ہیں۔

وہ صراحت سے کہتے ہیں کہ اگر پھاٹک 'او' اور پھاٹک 'پی' کے تالوں کو کھول بھی

دیا جائے، تو متنازعہ جگہ پر رکھی ہوئی مورتیوں کی حفاظت اور امن کے قیام کے لیے دوسرے بھی طریقے ہیں۔

ایس. ایس. پی فیض آباد شری پرم ویر سنگھ سے بھی میں نے بیان لیا، انہوں نے بتایا کہ پولیس فورس متنازعہ جگہ پر برقرار ہے، وہ اجودھیا کے دوسرے مندروں پر بھی نظم وضبط اور امن قائم رکھنے کے لیے پولیس کو تعینات کر دیتے ہیں، خصوصاً تیوہاروں کے موقع پر۔

انہوں نے یہ بیان دیا کہ خواہ پھاٹک 'پ' اور پھاٹک 'او' کے تالے کھولے جائیں، یا بند رکھے جائیں، نظم وضبط اور امن کو کامیابی کے ساتھ قائم رکھا جا سکتا ہے، نظم وضبط اور مذکورہ جگہ کی حفاظت صرف پھاٹک 'او' اور پھاٹک 'پ' کے تالوں پر ہی منحصر نہیں ہے، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا مندرجہ ذیل بیان نہایت برمحل ہے:

''''او' اور 'پ' گیٹ پر تالا بند کرنے کے علاوہ اور بھی طریقہ سے مورتیوں کی سُرکشا (حفاظت) کی بیوستھا (انتظام) کی جا سکتی ہے اور شانتی بیوستھا (نظم امن) قائم رکھی جا سکتی ہے''۔

اسی طرح ایس. ایس. پی فیض آباد کا یہ بیان سارے معاملہ کو قطعی طور پر طے کر دیتا ہے:

'' 'او' اور 'پ' تالے رہیں یا نہ رہیں، میں وہاں کی سرکشا بیوستھا سپھلتا پوروک، (حفاظت کا انتظام کامیابی کے ساتھ) کر سکتا ہوں، وہاں کی سرکشا 'او' 'پ' گیٹ کے تالوں سے ہی نہیں ہے، مجھے آوشیکتا (ضرورت) پڑنے پر وہاں سُرکشا قائم کرنے کا ادھیکار (اختیار) رہنا چاہیے''۔

تو یہ واضح ہوا کہ مورتیوں کی حفاظت یا نظم وضبط اور امن کے قیام کے لیے 'پ' اور 'او' پھاٹکوں پر تالے لگانا ضروری نہیں ہے، اس سے غیر ضروری طور پر مدعی اور اس کے فرقہ کے دوسرے لوگوں کو اشتعال دلانا ظاہر ہوتا ہے، یہ ضرورت بھی ظاہر نہیں ہوتی کہ مورتیوں

اورعقیدت مندوں کے درمیان ایک مصنوعی رکاوٹ پیدا کی جائے۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں متصادم فریق گذشتہ ۳۵ سالوں سے غیر فیصلہ شدہ صورت حال کے اسیر ہیں۔

کچھ لوگوں نے زمانہ کے کسی ایک واقعہ کی بنا پر اپنی عقل و دانش سے یہ خیال کیا کہ 'پ' اور 'ا' پھاٹکوں پر تالے لگا دیے جائیں لیکن تب سے کسی نے یہ پرواہ نہیں کی کہ دیکھے آیا ان تالوں کے بدستور بند رہنے کی ضرورت ہے بھی یا نہیں، فریقین کی سماعت گذاری کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ تالے کھولے جانے کی صورت میں اور یاتریوں کے لیے درشن ،ور پوجا کرنے کی اجازت دینے کے بعد دوسرے فرقہ یعنی مسلمانوں کی جمعیت حد تصور تک بھی متاثر نہیں ہوتی۔

یہ امر غیر متنازعہ ہے کہ مذکورہ جگہ فی الحال عدالت کے عمل دخل میں ہے اور گذشتہ ۳۵ سال سے ہندو پوجا کرنے کا غیر محدود حق رکھتے چلے آئے ہیں، جیسا کہ عدالت کے احکام ۱۳۵ر اور ۱۹۵۱ء (۱۹ر جنوری ۱۹۵۰ء، ۳ر مارچ ۱۵۱ء) سے ظاہر ہے۔

اگر ہندو ایک محدود پابندی کے ساتھ گذشتہ ۳۵ برسوں سے پوجا پاٹ کرتے رہے ہیں تو اگر 'ا' اور 'پ' پھاٹکوں کے تالے کھول دیے جائیں تو آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے میرے سامنے یہ بیان دیا کہ مسلم فرقہ کے افراد کو متنازعہ جگہ پر نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں ہے، ان کو وہاں جانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

اگر حالات یہی ہیں تو پھر تالوں کے ہٹا دینے کے نتیجہ میں نظم وضبط کے مسائل کھڑے ہونے کی نوبت نہیں آئے گی، یہ قطعی طور پر جائے نزاعی کے اندر کا معاملہ ہے، موجودہ اپیل اس حکم کے خلاف ہے جو ایسی درخواست پر دیا گیا جو کہ آرڈر ۳۹ کے مفہوم میں اسی طرح آتی ہے جیسے کہ ضابطۂ دیوانی کی دفعہ ایس ر۱۱۵ کے تحت آتی ہے۔

تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس. ایس. پی فیض آباد کے ان مثبت بیانات کے بعد کہ نظم وضبط کی صورت حال دوسرے ذرائع سے بھی قابو میں رکھی جاسکتی ہے اور اس کے لیے ان دروازوں پر تالے بند رکھنا ضروری نہیں ہے، ان تالوں کا بدستور بند رہنا صحیح نہیں۔

لہذا اس اپیل میں ایک وزن ہے۔

یہ اپیل منظور کی جاتی ہے اور مدعا علیہم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ فی الفور پھاٹک 'او' اور 'پ' کے تالے کھول دیں، وہ مدعی یا اس کے فرقہ کے افراد پر درشن کرنے یا پوجا کرنے میں کسی طرح مانع یا مزاحم نہ ہوں اور نہ رکاوٹ ڈالیں۔

بہرکیف مدعی علیہم نظم وضبط کو قابو میں رکھنے کے لیے اور یاتریوں کے داخلہ کی باقاعدگی کے لیے حالات کے تحت، کسی بھی آزادانہ اقدام کے مجاز ہوں گے۔

اپیل کے مصارف مقدمہ کے فیصلہ کے تابع ہوں گے (مسلم انڈیا انگریزی مارچ ۱۹۸۶ء، انگریزی متن کا ترجمہ)

تبصرہ: اس فیصلہ پر عام تبصرہ یہ ہے کہ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۸۵ء تک کے مقدمہ میں بابری مسجد کو مسجد ہی تسلیم کیا گیا، ۱۸۶۰ء میں یہ باضابطہ مسجد کی حیثیت سے رجسٹرڈ کرالی گئی، سنی سنٹرل وقف بورڈ کے ماتحت یہ مسجد مسجد کی حیثیت سے کردی گئی اور مسلمانوں کا دعویٰ یہ ہے کہ تالا بند ہونے سے پہلے اس میں مسلمان برابر نمازیں ادا کرتے رہے لیکن فاضل جج نے ان تمام باتوں کو نظر انداز کردیا۔

اور عام طور پر یہ قانونی اعتراض بھی ہوا کہ فیض آباد کے مصنف صدر کے فیصلہ کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی جاسکتی، مگر خلاف قانون اس کے خلاف اپیل کی گئی اور اپیل کرنے والا پہلے کسی مقدمہ میں مدعی نہیں ہوا تھا لیکن اس کی درخواست ڈسٹرکٹ جج نے اپنی عدالت میں داخل کرلی، اس مقدمہ میں جو مدعی علیہم تھے، ان کی سماعت کے لیے ان کو نہیں

بلایا گیا، حتی کہ سنی سنٹرل وقف بورڈ کو کچھ کہنے سننے کا موقع نہیں دیا گیا اور پھر سب سے اہم بات کوتو یہ تھی کہ جب یہ مقدمہ ہائی کورٹ میں پیش تھا تو اس کے ماتحت عدالت کو اس مقدمہ کی سماعت کا حق نہیں تھا، ڈسٹرکٹ جج کا فیصلہ یک طرفہ تھا، اس کے نتائج سے بے خبر ہوکر اس کا نفاذ اسی روز کر دیا گیا۔

مسلمانوں نے اس فیصلہ کے خلاف تین درخواستیں دیں لیکن جج نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ معاملہ اب ضلع انتظامیہ سے متعلق ہے۔

ہندوؤں میں خوشی اور مسلمانوں میں ماتم: بابری مسجد کا تالا کھولا گیا تو ہزاروں ہندو پوجا پاٹ کے لیے مسجد میں داخل ہو گئے، اس کا منظر ٹیلی ویژن پر بھی دکھایا گیا، پوری ریاست میں ہندوؤں نے خوشی میں چراغاں کیے، مسلمانوں نے اپنے گھروں پر غم میں سیاہ جھنڈے لہرائے، ہندوؤں کی طرف سے فتح و کامرانی میں جلسے ہوئے جلوس نکالے گئے، تو مسلمانوں کی جانب سے ماتمی جلوس نکلے، ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہندو مسلمان ایک قوم نہیں ہیں، بلکہ الگ الگ دو قومیں ہیں۔

یو. پی کے مسلم ممبران اسمبلی کا میمورنڈم: ڈسٹرکٹ جج کے فیصلے خلاف ۶ر فروری ۱۹۸۶ء کو اتر پردیش اسمبلی کے مسلم ممبروں نے یو. پی کے وزیر اعلیٰ کے سامنے ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں انہوں نے اس طرح فریاد کی۔

''ہم درج ممبران اسمبلی آنجناب کی توجہ بابری مسجد اجودھیا ضلع فیض آباد سے متعلق مندرجہ ذیل امور کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں، جسے آج کل سرکاری ذرائع ابلاغ تک رام جنم بھومی یا جنم استھان کے نام سے پکار رہے ہیں، ہماری استدعا ہے کہ آنجناب فوری ایسے اقدامات کریں جن سے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کا قوم کے سیکولر اور جمہوری کردار پر اعتماد بحال ہو۔

(۱) یہ کہ معتبر کتب تاریخ بشمول تزک بابری کے بموجب بابر نے اجودھیا کے کسی مندر کو مسمار نہیں کیا اور مبینہ بابری مسجد بابر کے ایک کمانڈر نے ایک خالی جگہ میں بنائی تھی اور اسے گذشتہ ساڑھے چار سو سال سے بابری مسجد کے نام سے جانا جاتا رہا ہے، کسی مندر کو منہدم کر کے اس کے کھنڈر پر کسی مسجد کے بنائے جانے کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا، آئین اکبری اور عالم گیر نامہ ان دونوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

(۲) یہ کہ ۱۸۸۵ء میں ایک شخص رگھوبیر داس نے خود کو جنم استھان کا مہنت بتا کر سب جج فیض آباد کی عدالت میں مقدمہ (۱۸۸۵/۶۱/۲۸۰ء) دائر کیا اور دعویٰ کیا کہ مسجد سے علاحدہ ایک چبوترہ شرقاً غرباً ۲۱ فٹ اور شمالاً جنوباً ۱۷ فٹ جنم استھان ہے، وہاں کوئی عمارت نہیں ہے، لہٰذا اسے دوسرے پجاریوں کو موسم گرما میں گرمی سے اور موسم سرما میں سردی سے اور برسات کے موسم میں بارش سے سخت پریشانی ہوتی ہے، اس لیے اس چبوترہ پر مندر بنانے کی اجازت دی جائے، ۱۹؍ جنوری ۱۸۸۵ء کی اسی درخواست میں پیراگراف نمبر ۴ میں کہا گیا تھا کہ مارچ اپریل ۱۸۸۳ء میں ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے بعض مسلمانوں کی طرف سے اعتراض کیے جانے کی وجہ سے مجوزہ مندر بنانے کی اجازت نہیں دی ہے۔

(۳) یہ کہ اسی مقدمہ (۱۸۸۵/۶۱/۲۸۰ء) کو ۲۴؍ دسمبر ۱۸۸۵ء کو سب جج فیض آباد نے خارج کر دیا اور جب ایشو نمبر ۶ پر بحث کی تو لکھا کہ گوپال سہائے امین کے تیار کردہ نقشہ نظری کے مطابق مسجد اور چبوترے کے درمیان ایک دیوار ہے“......اور ظاہر ہے کہ چبوترے اور مسجد کے درمیان علاحدہ علاحدہ حد بندی ہے، اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ حالیہ تنازع سے پہلے حکومت نے وہاں ایک حد بندی لائن بنادی تھی، اس فیصلہ میں یہ بھی درج ہے کہ ”اس کے گرد مسجد کی ایک دیوار ہے جس پر لفظ ”اللہ“ لکھا ہے، اگر چبوترے پر ایسی جگہ میں مندر بنایا گیا تو سنکھ اور گھنٹیوں کی آواز گونجے گی، جبکہ ہندو اور

مسلمان دونوں اس راہ سے گذر رہے ہوں گے، اس لیے اگر ہندوؤں کو یہاں مندر بنانے کی اجازت دی جاتی ہے تو ایک نہ ایک دن فساد کھڑا ہو جائے گا اور ہزاروں آدمی مارے جائیں گے" اور یہ کہ "اس موقع پر مندر تعمیر کرنے کی اجازت دینا فساد اور قتل و غارت کی بنیاد ڈالنا ہوگا، اس لیے...... حکمت عملی کے پیش نظر اور انصاف کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ درخواست منظور نہیں کی جانی چاہیے۔" یہ جج ایک پنڈت صاحب تھے، جن کا نام پنڈت ہری کشن تھا۔

(۴) متذکرۂ بالا فیصلہ اور ۲۴ر دسمبر ۱۸۸۵ء کے حکم کے خلاف کی گئی اپیل ۲۶ر مارچ ۱۸۸۶ء کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فیض آباد نے خارج کر دیا۔ (بحوالہ اپیل دیوانی نمبر ۲۷ر ۱۸۸۶ء مہنت رگھوبیر داس بنام سکریٹری آف اسٹیٹ وغیرہ۔

(۵) یہ کہ بابری مسجد کے کچھ حصوں کو ۱۹۳۴ء کے فرقہ وارانہ فساد میں نقصان پہنچا تھا، جسے حکومت نے مرمت کرا کے حسب سابق بنوا دیا تھا۔

(۶) یہ کہ ۲۶ر فروری ۱۹۴۴ء کے سرکاری گزٹ میں کمشنر اوقاف نے اسے سنی وقف قرار دیا۔

(۷) یہ کہ ۱۹۶۰ء کے مثل بندر جسٹر میں بھی اسے بابری مسجد دکھایا گیا۔

(۸) یہ کہ اس دستاویزی ثبوت کی بنیاد پر مسجد موصوف اور اس کے آس پاس کی زمین یو۔ پی سنٹرل وقف بورڈ میں یوپی مسلم ایکٹ ۱۹۳۶ء کے مطابق وقف نمبر ۲۶ فیض آباد کی حیثیت سے درج ہے۔

(۹) یہ کہ ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء تک مسجد مذکورہ میں بے روک ٹوک نماز ہوتی تھی، ۲۲ر ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی رات میں شری رام چندر جی کی مورتی خفیہ طور پر مسجد کے اندر رکھ دی گئی، یہ بات شری جے۔ این۔ اوگرا ڈپٹی کمشنر فیض آباد کے تحریری بیان مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۹۵۰ء سے ظاہر ہوتی ہے جو انہوں نے ریاستی حکومت کی جانب سے سول جج فیض آباد کی

عدالت میں مقدمہ ۲۳/۱۹۵۰ء کے ذیل میں جنوری ۱۹۵۱ء کو دیا تھا، جس کے فریق شری پرم ہنس رام چندر داس اور ظہور احمد وغیرہ تھے، اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ریاستی حکومت نے متنازعہ عمارت کو ہمیشہ سے بابری مسجد کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے، نہ کہ شری رام چندر جی کے مندر کی حیثیت سے لیکن یکم فروری ۱۹۸۶ء کو دفعتہً ضلع مجسٹریٹ اور ایس پی فیض آباد نے مقدمہ نمبر ۲/۱۹۵۰ء پر منصف صدر فیض آباد کے ۲۸/جنوری ۱۹۸۶ء کے فیصلہ کے خلاف متفرقہ دیوانی اپیل نمبر ۸/۱۹۸۶ء منجانب رمیش چند پانڈے بنام ریاست اتر پردیش وسہ دیگران پر دیے گئے، فیصلہ پر حقیقت کے بالکل خلاف اسٹینڈ لیا، یہ بات قابل توجہ ہے کہ مذکورۂ بالا رمیش چند پانڈے نہ اس مقدمہ کے فریق تھے اور نہ مقدمہ نمبر ۲/۱۹۵۰ء میں فریق بنائے گئے تھے۔

(۱۰) یہ کہ یہاں بات بھی توجہ کے قابل ہے کہ مقدمہ نمبر ۲/۱۹۵۰ء کے مدعی شری گوپال سنگھ ویشارد عرصہ ہوا انتقال کر چکے اور ان کی جگہ اب تک کسی دوسرے کو مدعی نہیں بنایا گیا ہے، اس صورت میں مقدمہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے اور قانونی طور پر یہ مقدمہ ۲۵/جنوری ۱۹۸۶ء کو یا یکم فروری ۱۹۸۶ء کو عدالت میں قابل سماعت ہی نہ تھا، اس لیے اس مقدمہ پر مسجد کے تالے کھولنے یا درشن اور پوجا پاٹ پر سے پابندی اٹھانے کا حکم دیا ہی نہیں جاسکتا تھا لیکن تعجب کی بات ہے کہ ریاستی قانونی مشیر اور ضلع مجسٹریٹ اور ایس. ایس. پی نے (جو عدالت میں موجود تھے) مقدمہ کے اس پہلو پر قطعاً توجہ نہ کی، ایسا لگتا ہے کہ پہلے سے منصوبہ بندی کے تحت ضلع انتظامیہ سے یکم فروری ۱۹۸۶ء کو یہ حکم اس لیے حاصل کیا گیا کہ احتجاج کرنے والی اکثریت کے ایک گروہ کو خوش کیا جائے اور یہ بات حلق سے نہیں اترتی کہ یہ کام ریاستی اور مرکزی حکومت کی پہلے سے منظوری اور اعلیٰ افسران اور ارباب حل وعقد کے مشورہ اور سازش کے بغیر ہوا ہوگا۔

(۱۱) یہ کہ جس طریقہ پر یکم فروری ۱۹۸۶ء کا مذکورہ بالا حکم مسلمانوں کے غیاب اور مسلمانوں کو فریق بنائے بغیر اور بعض مسلمانوں کی اپیل کی پروا کیے بغیر جو تاریخ مذکور پر فیصلہ کی افواہ سن کر عدالت میں آ گئے تھے، دیا گیا ہے، اس نے تمام ملک کے مسلمانوں کو شش و پنج میں ڈال دیا اور حکومت اور عدلیہ پر ان کے اعتماد کو زبردست ٹھیس لگی، یہ بات اور بھی زیادہ حیرت انگیز ہے کہ اس اپیل ۱۹۸۶ء میں سنی سنٹرل وقف بورڈ لکھنؤ اور دوسرے مدعیان کو جنہوں نے مقدمہ نمبر ۱۲/۱۹۶۱ء میں اسی مسجد کو اپنی تولیت اور قبضہ میں لینے کے لیے سول جج فیض آباد کی عدالت میں دائر کیا تھا (جو ابھی تک غیر فیصلہ شدہ ہے فریق نہیں بنایا گیا اور نہ انہیں اس بارے میں کوئی نوٹس دیا گیا اور یہ حکم مورخہ ۱؍ فروری ۱۹۸۶ء کو ان کی عدم موجودگی میں سنا دیا گیا، حالاں کہ مذکورہ مقدمہ نمبر ۱۲/سال ۱۹۶۱ء وہ بنیادی مقدمہ ہے جس کے ساتھ اس جائداد سے متعلق تین دوسرے مقدمے بشمول مقدمہ نمبر ۲ بابت ۱۹۵۰ء بھی ملحق ہیں۔

(۱۲) یہ کہ مسجد کا تالا کھول دیے جانے اور اسے پوجا کے لیے واگذار کرنے سے سارے ملک کے مسلمانوں میں ہیجان پھیلا ہوا ہے، انہیں زبردست جھٹکا لگا ہے اور وہ سراسیمہ و حیران ہیں، اس لیے ہم آپ سے استدعا کرتے ہیں کہ مسجد کے تقدس کی بقا اور حفاظت، نیز مسلمانوں کا ملک کے عدالتی نظام اور اس کے سیکولر کردار اور قوم کے جمہوری ڈھانچہ پر اعتماد بحال کرنے کے لیے فوری تدارک کی اقدام کریں۔

لہٰذا ہم ریاستی سرکار سے بلا تاخیر مندرجہ ذیل اقدامات کا مطالبہ کرتے ہیں:

(۱) بابری مسجد اور اس سے متعلقہ وقف کی جائداد کو تحفظ دے کر علی حالہ رکھا جائے جیسی کہ وہ ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو تھی اور اس کی دیواروں وغیرہ کی مرمت کرائی جائے اور اسے محفوظ کر دیا جائے۔

(۲) وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل وغیرہ کے اشتعال انگیز نعروں کا نوٹس لیا جائے، ان کے روکنے کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں نیز اس سلسلہ میں مجرمین کو سزائیں دی جائیں۔

(۳) مسجد کے اندر ہونے والی پوجا پاٹ فوری روک دی جائے اور مسجد کے اندر رکھی گئی مورتیوں کو وہاں سے ہٹوایا جائے۔

(۴) مسلمانوں کو مذکورۂ بالا بابری مسجد میں بغیر کسی مزاحمت کے نماز پڑھنے اور مسجد کا اہتمام وانصرام کرنے کی اجازت دی جائے۔

(۵) مسجد کا قبضہ کسی قانون کے ذریعہ یا دائرشدہ مقدمات کو جلد از جلد فیصلہ کے ذریعہ مسلمانوں کو واپس دلایا جائے۔

مخلصان

(۱) محمد مسعود خان	(۲) قاضی کلیم الرحمٰن	(۳) شفیق الرحمٰن (برق)
(۴) محمد اعظم خان	(۵) قاضی محی الدین	(۶) عبدالوحید قریشی
(۷) امیر عالم خان	(۸) خورشید احمد	(۹) عبدالودود
(۱۰) بنیاد حسین انصاری	(۱۱) فرید محفوظ قدوائی	(۱۲) فضل الباری
(۱۳) فصیح الرحمٰن خان عرف منن خاں		(۱۴) حاجی محمد حیات
(۱۵) رضوان الحق	(۱۶) محمد عقیل	(۱۷) مستمد علی خان

(بشکریہ الحسنات اردو ڈائجسٹ بابری مسجد نمبر)

بعض ہندوؤں کی غیر دانشورانہ سرگرمیاں: اس قضیہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ پڑھے لکھے ہندوؤں کو یہ احساس رہا کہ یہ جو الزام ہے کہ بابر نے رام جنم بھومی مندر کو توڑ کر ایک مسجد بنوائی، وہ کسی مستند اور معاصر تاریخ کے حوالہ سے ثابت نہیں کیا جا سکتا، اس لیے ان

کے کچھ چابک دست اہل قلم نے اس کی بھی کوشش شروع کردی کہ اس بات کو معاصر تاریخوں کے حوالہ سے ثابت کیا جائے، جس کی ایک مثال ذیل میں درج کی جاتی ہے:

یو پی کے مشہور اخبار پانیر کی چار اشاعتوں یعنی ۹/۱۰/۱۱/۱۲ فروری ۱۹۸۶ء میں ایک مضمون بڑی جلی سرخیوں کے ساتھ شایع ہوتا رہا، جس کو پڑھ کر عام ناظرین یہ سمجھیں گے کہ یہ مضمون بڑی محنت اور تحقیق کے ساتھ لکھا گیا ہے، اس میں کالم نگار کا بیان ہے کہ ''مغل شاہنشاہ بابر نے رام جنم بھومی کو ۱۵۲۸ء میں بابری مسجد میں بدل دیا لیکن ایسا کرنے میں اس کو ہندوؤں کی پانچ شرطیں منظور کرنی پڑیں جیسا کہ توجک بابری کے صفحہ ۵۳۲ پر ہے'' (پانیر ۱۱ فروری ۱۹۸۶ء ص ۱) مغل بادشاہوں کے عہد میں توجک بابری کے نام سے تو کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، اگر اس سے مراد تزک بابری ہے تو پھر ایسے اہل قلم کو کوئی تاریخی تحریر لکھنے کا حق نہیں جو توجک بابری اور تزک بابری میں تفریق نہ کر سکے، اس مضمون میں اس کتاب کے ص ۵۳۲ کا جو حوالہ دیا گیا ہے، وہ معلوم نہیں کون سی تزک بابری ہے، یہ ترکی زبان میں قلم بند ہوئی جو کسی بھی ہندوستانی مؤرخ کی دسترس سے باہر ہے۔

اس کا ترجمہ فارسی میں اکبر کے عہد میں عبدالرحیم خان خاناں نے کیا جواب تک نہیں چھپا ہے، اس کا انگریزی ترجمہ اے. ایس. بیورج نے کیا جس کا نام اس نے ''دی بابر نامہ ان انگلش'' رکھا، اس کا ترجمہ اردو میں بھی تزک بابری اردو معروف بہ بابر نامہ کے نام سے ہوا، پانیر کے کالم نگار نے اگر تزک بابری کے انگریزی ترجمہ کا حوالہ دیا ہے تو میرے سامنے اس کی پہلی اور دوسری جلدیں ہیں، جو ۱۹۲۲ء میں چھپیں اور یہی علمی حلقوں میں پڑھی جاتی ہیں، اس کے ص ۵۳۲ پر ایسی باتیں نہیں لکھی گئی ہیں جو کالم نگار نے لکھی ہیں، انگریزی ترجمہ کرتے وقت اس میں ترکی نسخے کے صفحات بھی درج کر دیے گئے ہیں، جو ۳۸۲ پر ختم ہو جاتے ہیں اردو ترجمہ ۳۶۴ صفحات پر مشتمل ہے، یہ تو نہیں معلوم اس کا ترجمہ ہندی میں ہوا

ہے، یا نہیں، کالم نگار کو وضاحت کرنی چاہیے تھی کہ آخر کس تزک بابری کا وہ حوالہ دے رہے ہیں۔

ہم ہندوستان کے مؤرخین اور محققین کی طرف سے پورے وثوق کے ساتھ یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ تزک بابری کے ص ۵۳۲ کے حوالہ سے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے اور اگر صحیح ہے تو وہ یہ بتائیں کہ کون سی تزک بابری کا یہ حوالہ ہے۔

کالم نگار نے اپنے ناظرین کو یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ رام جنم بھومی مندر کو منہدم کر کے بابر نے مسجد کیسے بنائی، ان کا بیان ہے کہ بابر نے رانا سانگا سے پہلی جنگ آگرے کے پاس فتح پور سیکری میں کی اس وقت اودے پور کی سلطنت اجودھیا تک پھیلی ہوئی تھی، اس پہلی جنگ میں وہ شکست کھا گیا تو بھاگ کر اجودھیا چلا گیا، یہاں آ کر وہ دو مسلم صوفی بزرگوں جلال شاہ اور خواجہ کجل عباس قلندری موسیٰ (عاشقان) سے ملا، اول الذکر بزرگ نے اس کی کامیابی کے لیے دعائیں کیں، جس کے بعد بابر نے فتح پور سیکری کی دوسری لڑائی جیت لی، وہ اجودھیا آیا، جلال شاہ کی دعاؤں کا صلہ دے کر اپنی ممنونیت کا اظہار کرنا چاہا تو جلال شاہ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ رام جنم بھومی کو گرا کر اس کی جگہ مسجد بنائی جائے بابر نے ان کی خواہش پوری کی۔

کالم نگار نے اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ خواجہ کجل عباس (قزلباش) اور جلال شاہ دونوں مہاتما شیا نند جی کے چیلے تھے، اس وقت رام جنم بھومی کا نظم و نسق ان ہی کے سپرد تھا، یہ دونوں اپنے گرو کے اشیرواد وں کے ساتھ مسلمان ہو گئے تھے اور وہ مسلمانوں میں بہت مقبول ہوئے، جلال شاہ نے بابر سے کہا کہ رام جنم بھومی مندر ایک پوتر اور اوتاری جگہ ہے، اس کی جگہ پر ایک چھوٹا نیا شہر آباد کر کے مسلمانوں کے لیے ایک 'خرد مکہ' بنایا جائے، بابر نے اپنے فوجی سردار میر بانکی (میر باقی) کو حکم دیا کہ اس کی جگہ مسجد بنائی جائے، میر بانکی نے حکم کی تعمیل شروع کی، مگر مسجد کے لیے دن میں جو دیوار اٹھائی جاتی وہ رات میں گر جاتی، میر

بانکی نے بابر کو اجودھیا آنے کی دعوت دی، تاریخ میں ہے کہ بابر نے یہاں آکر سادھوؤں اور مہاتماؤں کی پانچ باتیں منظور کرلیں، جیسا کہ توجک بابری (تزک بابری) میں لکھا ہے۔

جو باتیں بابر نے منظور کیں وہ یہ تھیں: (۱) مسجد کا نام سیتا باک ہوگا (۲) اس میں مینار نہیں ہوگا (۳) مسجد یعنی رام جنم بھومی کے پاس ہندوؤں کے لیے پری کرما بھی بنایا جائے گا، (۴) اس کا بڑا پھاٹک صندل کا ہو (۵) ہندوؤں اور مہاتماؤں کو اس کے اندر پوجا کی آزادی ہو اور مسلمان اس میں صرف جمعہ کی نماز پڑھیں، کالم نگار یہ بھی لکھتا ہے کہ رام جنم بھومی کی خصوصی محراب پر فارسی کے کتبے ہیں اور کچھ منا (؟) زبان میں بھی ہیں، ان دونوں سے ظاہر ہے کہ یہ سیتا باک ہے، اس کا شمالی حصہ پھر سے بنایا گیا اور اب تک سیتا باک کے نام سے مشہور ہے۔

کالم نگار کے بیان کے مطابق یہ ساری باتیں تزک بابری میں درج ہیں، وہ تزک بابری کے ان صفحات کی نشاندہی کریں جہاں سے یہ ساری تفصیلات لی گئی ہیں، ورنہ ہندوستان کے سارے مؤرخوں کو یہ کہنے میں تامل نہیں ہوگا کہ یہ ساری باتیں من گھڑت ہیں، جن کا تعلق نہ تزک بابری اور نہ کسی مستند تاریخ سے ہے، یہ کہنا صحیح نہیں کہ بابر اور رانا سانگا کی لڑائیاں فتح پور سیکری میں ہوئیں، یہ بھی درست نہیں کہ یہاں دو لڑائیاں لڑی گئیں، صرف ایک لڑائی کنواہہ کے میدان میں ہوئی، جس میں بابر کامیاب رہا، اس بات میں افسانویت ہے کہ بابر پہلی جنگ ہارا تو اجودھیا آیا اور پھر یہاں کے بزرگوں کی دعائیں لے کر گیا تو کامیاب رہا اور پھر واپس آیا تو مسجد بنائی اور پھر ہندوؤں سے سمجھوتہ کیا، تزک بابری میں بابر نے اپنی زندگی کے تمام جزوی واقعات لکھے ہیں، اتنے اہم واقعہ اور سمجھوتہ کو کیسے نظر انداز کرسکتا تھا، وہ اودھ ضرور آیا مگر وہ پورب کے افغان سرکشوں کو صرف دبانے کے لیے یہاں پہنچا، وہ اس سلسلہ میں چین تیمور سلطان، شیخ بایزید تردی بیگ، فوج بیگ،

بابا چہرہ، باقی شقاول، لکھنؤ، گومتی، گھاگھرا اور سردو وغیرہ کا تو ذکر کرتا ہے مگر رام جنم بھومی، جلال شاہ اور خواجہ کجل شاہ کے نام تک نہیں لیتا (ترجمہ تزک بابری اردو، ص ۳۰۔ ۳۲۹، بابرنامہ از اے۔ ایس. بیورج...... ص ۶۰۲۔ ۶۰۱، ۱۹۲۲ء ایڈیشن) بابر یہاں مسلمانوں ہی سے لڑنے آیا تھا، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ علاقے ان کے زیر نگین تھے، پھر معلوم نہیں کالم نگار نے یہ کیسے دعویٰ کیا کہ اجودھیا تک رانا سانگا کی حکومت تھی۔

ابوالفضل کی اکبرنامہ، ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ، خافی خان کی منتخب اللباب، سجان رائے کی خلاصۃ التواریخ یا مغلوں کے دور کی کسی تاریخ میں رام جنم بھومی کے انہدام کا ذکر نہیں، ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن کی ہسٹری آف انڈیا ج ۴ میں تزک بابری کے کچھ اقتباسات ہیں، یہ دونوں مؤرخین مسلمانوں کی مندر شکنی کے واقعات کے تلاش میں رہتے ہیں، انہوں نے بھی تزک بابریؒ کے اقتباسات میں رام جنم بھومی کے انہدام کا ذکر نہیں کیا ہے، ولیم ارسکن اور راش بروک ولیم نے بابر پر دو کتابیں لکھی ہیں، جو یونیورسٹیوں کے نصاب میں ہیں، ان میں بھی اس انہدام کا ذکر نہیں ہے۔

اے. ایس. بیورج نے تزک بابری کا جو ترجمہ انگریزی میں کیا ہے اس میں اس کے حواشی اور تعلیقات میں نہ جلال شاہ، نہ خواہ قزل شاہ اور نہ ہندوؤں سے بابر کے سمجھوتے کا ذکر ہے۔

ہم گذشتہ اوراق میں تو لکھ چکے ہیں کہ پانیر کے کالم نگار نے دیوانِ اکبری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اکبر نے بیربل اور ٹوڈرمل کو بھیج کر ہندوؤں کے سادھوؤں اور مہاتماؤں سے یہ سمجھوتہ کیا کہ وہ مسجد کی بائیں جانب ایک چبوترہ بنالیں جو رام مندر کہلائے گا، یہ ہندوؤں کے پوجا پاٹ اور درشن کے لیے ہوگا، اکبر کو ایسا اس لیے کرنا پڑا کہ ہندوؤں نے کم سے کم بیس مرتبہ اس پر حملے کیے تھے، جیسا کہ دیوان اکبری سے ظاہر ہے، ہم پہلے بھی لکھ

چکے ہیں کہ اکبر کے زمانہ میں دیوان اکبری کے نام سے کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی، اگر اس سے آئین اکبری مراد ہے تو ہم پھر ہندوستان کے مؤرخوں کی طرف سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ آئین اکبری کے کسی صفحہ پر ایسی باتیں نہیں لکھی گئی ہیں، اس میں اودھ یعنی اجودھیا کے ذکر میں جو کچھ ہے اس کو ہم گذشتہ اوراق میں نقل کر چکے ہیں۔

پانیر کے کالم نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے رام مندر کو ساتویں رمضان کو بالکل منہدم کر دیا، اس کے لیے عالم گیر نامہ ص ۶۳۰ کا حوالہ دیا ہے، میرے سامنے عالم گیر نامہ ہے جو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شایع ہوئی ہے، یقین کامل کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے ص ۶۳۰ پر ایسی کوئی تحریر نہیں ہے اور نہ اس کے کسی اور صفحہ پر اس چبوترہ کے انہدام کا ذکر ہے۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ بابری مسجد کی صرف اتنی حقیقت ہے کہ بابر کے ایک امیر میر باقی نے (جس کو کالم نگار نے میر بانکی لکھا ہے) اجودھیا میں مسلمانوں کے لیے ایک مسجد بنوادی تھی، جس کا تعلق رام جنم بھومی کے انہدام سے کچھ بھی نہیں، اس مسجد پر قبضہ کرنے میں سیاسی استحصال کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، مگر اس رنگ کو پیدا کرنے میں غلط قسم کی تحقیقات اور تعبیرات سے ہندوستان کے علم تحقیق اور تاریخ کے معیار کو بدنام نہ کیا جائے۔

جناب سید شہاب الدین کی طرف سے مسلم مجلس مشاورت کا میمورنڈم: ۱۵ر فروری ۱۹۸۶ء کو مسلم مجلس مشاورت نے وزیر اعظم کے سامنے یہ میمورنڈم پیش کیا:

مسلمانانِ ہند کے جانب سے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت بابری مسجد اجودھیا مسلمانوں کے سپرد کیے جانے کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل گذارشات پیش کرنا چاہتی ہے۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یکم فروری ۱۹۸۶ء کو ڈسٹرکٹ جج فیض آباد نے ایک پرائیویٹ شخص کی درخواست پر آرڈر پاس کرتے ہوئے بابری مسجد کے صحن کا تالا کھولنے کی

اجازت دے دی، تاکہ ہندو مسجد کے اندر آزادی کے ساتھ پہنچ کر پوجا کرسکیں، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے غالباً ریاستی حکومت کے ایماء پر یہ فیصلہ دیا ہے، اس طرح یہ مسجد قلم کی ایک جنبش کے ساتھ ہندوؤں کے قبضہ میں دے دی گئی، جب کہ ۱۹۵۰ء میں حق ملکیت کا جو مقدمہ دائر کیا گیا تھا وہ ہنوز غیر فیصلہ شدہ ہے، ایک تاریخی مسجد کو جو ۴۵۰ سال قبل بنائی گئی تھی، ایک عدالتی فیصلہ کے ذریعہ ہندو مندر میں تبدیل کردیا گیا۔

جناب وزیر اعظم ! جیسا کہ ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے اپنے حلفیہ بیان میں کہا ہے، کہ ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں مسجد کے اندر چوری چھپے بت رکھ دیے گئے اور اس طرح امن وقانون کا مسئلہ کھڑا کردیا گیا، اس کے بعد ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ نے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۴۵ کے تحت ایک آرڈر ۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو پاس کرتے ہوئے اس احاطہ کے دعویداروں سے کہا کہ وہ تحریری بیان داخل کریں، چنانچہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۴۶ کے تحت جائداد مذکور کو سرکاری قبضہ میں رکھنے کا فیصلہ سٹی مجسٹریٹ نے صادر کردیا، جب تک کہ سماعت کی اہل کسی عدالت کا فیصلہ اس کی ملکیت کے بارہ میں نہ ہوجائے، اس کے ساتھ میونسپل بورڈ فیض آباد واجودھیا کے چیرمین کو مہتمم قرار دیا گیا اور انہیں جائداد کی نگرانی اور اس کے نظم وانصرام کے لیے ایک منصوبہ پیش کرنے کا اختیار دیا گیا، اس طرح ۱۹۵۰ء میں یہ جائداد مسلمانوں کے ہاتھ سے لے لی گئی، بت نہیں ہٹائے گئے اور بیرونی صحن میں ہندوؤں کے مذہبی رسومات پابندی سے ہوتے رہے، اب ۱۹۸۶ء میں یہ جائداد باقاعدہ طور پر ہندوؤں کے حوالہ کردی گئی۔

محترم وزیر اعظم ! ڈسٹرکٹ جج کا آرڈر ہندوستانی عدالتی نظام کی تاریخ میں بے مثال ہے اس کا غیر قانونی ہونا ریکارڈ ہی سے ظاہر ہے، اس لئے کہ:

(۱) یہ معاملہ عدالت کے سامنے ہے، کیوں کہ ایک اہل سماعت عدالت میں چار

مقدمے پڑے ہیں جن پر فیصلہ باقی ہے۔

(۲) درخواست دہندہ کو اس سلسلہ میں کوئی حق مداخلت نہیں پہنچتا اور دفعہ ۱۴۶ کے تحت تمام ہندوؤں کو اس بات کا حق حاصل نہیں اور مسجد تک رسائی کا حق ۱۹۵۰ء کے آرڈر کے تحت صرف ایک ہندو پروہت کو دیا گیا ہے۔

(۳) کسی بھی مسلمان کو یہاں تک کہ مقدمہ سے منسلک فریق کو بھی سماعت میں شامل نہیں کیا گیا۔

(۴) اس مسجد یا کسی بھی مسجد میں پوجا پاٹ کرنے سے مسلمانوں کے احساس پر کیا گذرے گی، اس کا مطلق خیال نہ رکھا گیا۔

(۵) سنی وقف بورڈ اتر پردیش کو جس کے ریکارڈ میں یہ مسجد وقف جائداد کی حیثیت سے رجسٹرڈ ہے، اس سلسلہ میں مطلع بھی نہیں کیا گیا، سماعت میں شریک کرنا تو دور کی بات ہے۔

(۶) مہتمم جس نے غالباً اندرونی دروازہ میں تالا لگایا تھا، اسے بھی نہیں بلایا گیا اور اس طرح نگرانی اور نظم وانصرام کے حقوق کی خلاف ورزی کی گئی۔

(۷) یہ آرڈر اس بنیاد پر پاس کیا گیا کہ تالا کھول دینے سے ضلع حکام کے لیے امن وقانون کا کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوگا، مگر اس حقیقت کو فراموش کر دیا گیا کہ مسجد کو سچ مچ مندر میں تبدیل کر دینے کا مطلب ان لوگوں کے نزدیک فتح ہوگی جو تالا توڑ دینے کی دھمکی دے چکے تھے۔

(۸) سرکاری قبضہ میں تالے یا بغیر تالے کے پڑی ہوئی جائداد تک رسائی کے سوال کو بھی ٹھکرا دیا گیا۔

(۹) اب اس طرح جو بات عمل میں لائی جا چکی ہے، اس سے دونوں فرقوں کے

درمیان پرانے قبضہ کو طے کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جائے گا اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا۔

تاہم محترم وزیر اعظم! ضلع حکام نے اس آرڈر پر بڑی نرمی اور عجلت کے ساتھ عمل درآمد کیا اور حکومت اتر پردیش جو مدعیٰ علیہ کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے خلاف یہ آرڈر جاری کیا گیا، اس نے آرڈر کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی اور نہ آرڈر پر غور کرنے کے لئے کہا اور نہ التواء کے لیے اپیل کی، اس کے بعد اس فتح کا جشن منایا گیا، شہروں اور گاؤں میں جلوس نکالے گئے، دیے جلائے گئے، مٹھائیاں تقسیم کی گئیں، اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں اور توہین آمیز نعرے لگائے گئے اور اسی کے ساتھ دھمکیاں دی گئیں کہ مزید مسجدوں کو مندروں میں تبدیل کر دیا جائے گا، مسلم فرقہ ان سب واقعات کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھتا رہا اور اشتعال انگیزیوں کے باوجود صبر سے کام لیتا رہا۔

محترم وزیر اعظم! اس بات کی کوئی معاصرانہ شہادت نہیں کہ بابری مسجد کسی ایسی زمین پر بنائی گئی تھی جو کبھی مندر سے تعلق رکھتی تھی جسے جان بوجھ کر مسمار کر دیا گیا تھا اور اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ شری رام چندر جی کی جائے پیدائش پر وہ بنائی گئی تھی، ایک لحاظ سے پورا اجودھیا ان کی جائے پیدائش ہے، مگر خصوصی طور سے ان کی جائے پیدائش ۲۰x۲۰ پیمائش کے پلیٹ فارم کی شکل میں ہے جو اصل مسجد سے بالکل الگ اور مختلف ہے اور اس مقام کو صدیوں سے عزت کی نظر سے دیکھا جاتا رہا، اس مقام کی حد بندی انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی حکام نے کر دی تھی اور ایک باڑ باندھ دی تھی، جس کے اندر مسجد تھی، جہاں مسلمان عبادت کر سکتے تھے جب کہ باڑ کے باہر اونچے پلیٹ فارم پر ہندوؤں کو پوجا پاٹ کرنے کی اجازت دی گئی (پی. کارنیگی سٹلمنٹ آفیسر و قائم مقام کمشنر فیض آباد کا بیان تحصیل فیض آباد ضلع فیض آباد لکھنؤ ۱۸۷۰ء کے ایک تاریخی نوشتہ میں)

معزز وزیر اعظم! اب یہ بات آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ جنم استھان، بابری مسجد سے بالکل الگ ہے مگر آر. ایس. ایس اور وشو ہندو پریشد کی قیادت میں جارحیت پسند ہندو عناصر نے بابری مسجد پر قطعی قبضہ کرنے کے لئے پچھلے دو برسوں سے مہم چلائی رکھی تھی اور ان کی مبینہ دلیل یہی ہے کہ مسجد جائے پیدائش پر کھڑی ہے، ان لوگوں سے جان بوجھ کر حقیقت حال کو گڈمڈ کر کے مذہبی ہسٹیر یا پیدا کیا ہے۔

محترم وزیر اعظم! اس مہم کا مقصد مذہبی نہیں بلکہ سیاسی ہے، اس کا مقصد سیکولر نظام کو درہم برہم کرنا، قانون کی حکمرانی کو تباہ و برباد کرنا، مسلمانوں کو ذلیل کرنا، ہندو اور سلمانوں کے درمیان منافرت پھیلانا اور ہندوؤں کی جارحانہ برتری کے لیے ملک کے حکمرانوں کو فاشسٹوں کے حوالہ کرنے کے لیے تیار کرنا ہے، بدقسمتی سے عاملہ اور عدلیہ میں ہمدرد عناصر موجود ہیں اور سیاسی پارٹیوں میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو آپس میں ہاتھ ملا چکے ہیں اور جمہوری دباؤ کے تحت سیکولر سیاسی پارٹیاں خاموشی کو ترجیح دے رہی ہیں۔

جناب وزیر اعظم ! ہم اس ناجائز قبضے سے مسلمانوں کے ذہنی کرب کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے، سیکولر نظام میں ان کا یقین ختم ہو گیا ہے، عدلیہ میں ان کے اعتماد کو جھٹکا لگا ہے، دستوری ضمانت اپنے معنی کھو چکی ہے اور قانون کی حکمرانی ایک دھوکہ ثابت ہو رہی ہے، سیاسی نظام جارحیت پسندی کے تابع ہوتا جا رہا ہے، ذرائع ابلاغ بشمولیت دوردرشن یک طرفہ پروپیگنڈہ میں مصروف ہیں، اس لے کہ وہ تصویر کو اس قدر توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں کہ شناخت مشکل ہے، جیسے کہ وہاں مسجد کا وجود ہی نہ تھا اور یہ مسلمان ہی ہیں، جو ہندوؤں کو مندر میں پوجا پاٹ کرنے سے روک کر جھگڑا کھڑا کر رہے ہیں۔

محترم وزیر اعظم ! آپ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اگر ایک فرقہ مکمل طور پر بے بس اور محرومیت کا شکار ہو تو اس کے نتائج کتنے تباہ کن ہو سکتے ہیں، اگر وہ ملک کے نظام سے

الگ ہوگیا تو یا تو وہ منجمد ہو جائیں گے یا غیر قانونی طریقۂ کار اپنالیں گے، لہٰذا ہم بڑے ادب کے ساتھ آپ سے دریافت کرتے ہیں، کہ کیا آپ کو اس عظیم ملک کے وزیر اعظم کی حیثیت سے اس معاملہ میں مداخلت کر کے صورت حال کو سنبھالنا نہیں چاہیے اور ایک فرقہ وقار بحال کرنے اور آزادیٔ مذہب کے بنیادی حقوق کا تحفظ کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے؟

آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت آپ سے اپیل کرتی ہے کہ اگر یکم فروری ۱۹۸۶ء کا آرڈر آپ کو غلط اور غیر ضروری معلوم ہو، جس نے خوامخواہ بحران پیدا کر دیا ہے تو آپ اس آرڈر کے خلاف حکومت اتر پردیش کو آرڈر کے خلاف اپیل کرنے کو کہیں، یا درخواست گذارنے کو کہیں تاکہ سابقہ صورت حال برقرار رہے اور ملکیت کا فیصلہ صادر ہونے سے قبل کسی بھی تعمیراتی تبدیلی سے روکا جائے۔ مشاورت آپ سے یہ بھی اپیل کرتی ہے کہ مرکزی حکومت اس مقدمہ میں خود مداخلت کرے، کیوں کہ اس مقدمہ کے بہت دوررس نتائج برآمد ہوں گے اور اس سے ملک میں شدید ردعمل ہوگا، آپ اٹارنی جنرل آف انڈیا کو مقرر کریں کہ وہ مرکزی حکومت کی پوری نمایندگی کرے۔

جناب وزیر اعظم! مشاورت، کلکتہ ہائی کورٹ میں آپ کی بروقت مداخلت کے لیے بے حد شکر گذار ہے اور پوری توقع رکھتی ہے کہ آپ ایک بار پھر تنگ دلانہ سیاسی مصلحتوں اور عددی دباؤ سے اوپر اٹھ کر مسلمانوں میں ایسی تھوڑی سی امیدیں پیدا کر دیں کہ وہ مساوی وقار کے ساتھ ایک آزاد ملک میں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے زندگی گذار سکیں۔

(بحوالہ مسلم انڈیا اردو، مارچ ۱۹۸۶ء)

وزیر اعظم کی خدمت میں مسلم ممبران پارلیمنٹ کا میمورنڈم، ۳۰ر مارچ ۱۹۸۶ء: بابری مسجد اجودھیا کے سلسلہ میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فیض آباد کے حالیہ فیصلہ نے مسلمانوں کو گہرے صدمہ سے دوچار کر دیا ہے اور ملک میں ایسی صورت حال

پیدا کردی ہے جس کو اگر دانائی سے حل نہ کیا گیا تو پھر وہ صورت ایک ایسے فتنہ کا پیش خیمہ بن سکتی ہے جو نا قابل اصلاح ہو، لہذا ہم مسلمان ممبران پارلیمنٹ کی یہ خواہش ہے کہ جناب محترم کے سامنے حقایق کو پیش کر دیں، ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ ازراہِ کرم اس معاملہ میں فوری مداخلت کریں اور مسلمانوں میں اس اعتماد کی فضا بحال کریں کہ دستور ہند کے الفاظ و معانی کے مطابق وہ ایک سیکولر ریاست میں مساوی درجہ کے شہری کی حیثیت سے مذہبی آزادی سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ بابری مسجد کی تاریخی اور قانونی حیثیت کے سلسلہ میں درج ذیل حقایق پرزور اور نا قابل تردید شہادتوں پر منحصر ہیں:

(۱) بابری مسجد کی تعمیر، بادشاہ بابر کے دور حکومت میں ہوئی، اسے بابر کے ایک گورنر میر باقی نے ۱۵۲۸ء میں ایک خالی قطعۂ زمین پر تعمیر کرایا۔

(۲) بین الاقوامی سطح پر معروف اور مشہور تاریخ داں اے. ایس. بیورج جنہوں نے تزک بابری کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے اور اس پر قیمتی حواشی ترتیب دیے ہیں، انہوں نے اپنی کتاب میمارس آف بابر جلد دوم ص ۸۰۔۶۷۹ طبع لندن ۱۹۲۴ء میں بابر کے سفر اودھ کا ذکر کیا ہے، انہوں نے ایک ایک لمحہ کی تصنیفات اس میں درج کی ہیں لیکن کہیں یہ ذکر نہیں کیا کہ بابر اجودھیا میں داخل ہوا، یہ ذکر ضرور ملتا ہے کہ شیخ بایزید جو اودھ کا گورنر تھا اور باغی ہو گیا تھا، بابر نے اس کی جگہ باقی بیگ تاشکندی (میر باقو) کو اودھ کے گورنر کی حیثیت سے مقرر کیا اور چلا گیا، ۱۶ر ستمبر ۱۹۳۸ء کے وقف ڈسٹرکٹ کمشنر فیض آباد کی ایک رپورٹ سے بھی اسی حقیقت کا مزید اثبات ہوتا ہے، اس رپورٹ کو انہوں نے اتر پردیش وقف کے چیف کمشنر کے سامنے داخل کیا تھا، علاوہ ازیں اے. ایس۔ بیورج کی معلومات کے مطابق مسجد کی دیواروں پر لکھی ہوئی تحریروں سے بھی یہ ثابت ہوتی ہے، فیض آباد کے سب جج پنڈت ہری کشن

کے ایک فیصلہ مورخہ ۲۴/دسمبر ۱۸۸۵ء (مقدمہ نمبر ۶۱/۲۸۰) سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے، (پنڈت ہری کشن کے فیصلہ کی ایک کاپی اس میمورنڈم کے ساتھ منسلک ہے)

(۳) ڈسٹرکٹ وقف کمشنر کی مذکورۂ بالا رپورٹ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دو گاؤں بھارے پور اور شولا پور کو ۱۸۶۴ء میں لگان سے آزاد قطعۂ اراضی قرار دیا گیا تھا تاکہ بادشاہ بابر کے منظور کیے ہوئے ساٹھ روپئے سالانہ کی رقم کے عوض ان گاؤں سے مسجد کا انتظام کیا جائے، بابر کی اس رقم کو بعد میں شاہ اودھ نے بڑھا کر ۳۰۲ روپئے تین آنے چھ پائی کر دیا تھا۔

(۴) ۱۸۸۵ء میں ایک شخص مہنت رگھوبیر داس نے فیض آباد کے سب جج کی عدالت میں ایک مقدمہ دائر کیا (مقدمہ ۱۸۸۵/۶۱/۲۸۰ء) اور یہ مطالبہ کیا کہ رام جنم استھان کا چبوترہ بغیر عمارت اور چھت کے ہے اور پجاریوں کو موسمی اثرات مثلاً سخت گرمی، تیز بارش اور شدت کی سردی کی وجہ سے زبردست دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس نے مذکورہ چبوترہ ۲۱x۱۷ فٹ پر پوجا کرنے کے لیے ایک مندر بنانے کی اجازت چاہی۔

یہ مقدمہ ۱۹/جنوری ۱۸۸۵ء میں داخل کیا گیا، اس کے پیرا نمبر ۴ میں یہ شکایت بھی درج ہے کہ اپریل ۱۸۸۳ء میں فیض آباد کے کمشنر نے فرقہ وارانہ اتحاد کے لیے مذکورہ مندر کی تعمیر کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

(۵) فیض آباد کے سب جج پنڈت ہری کشن نے ۲۴/دسمبر ۱۸۸۵ء میں مذکورہ مقدمہ نمبر ۱۸۸۵/۶۱/۲۸۰ء کو اپنے ایک حکم کے ذریعہ خارج کر دیا، اس حکم کی بنیاد عدالت کے ایک امین مسٹر گوپال سہائے کا تیار کردہ متنازعہ جگہ کا نقشہ تھا، عدالت نے یہ دیکھا کہ مسجد اور چبوترہ کے درمیان ایک دیوار ہے اور یہ واضح ہے کہ چبوترہ اور مسجد کے درمیان جدا جدا حدبندیاں ہیں، اس سچائی کو مزید سہارا اس حقیقت سے بھی ملا کہ حکومت نے نزاع سے پہلے حدبندی کی ایک دیوار وہاں تعمیر کی تھی، عدالت نے یہ بھی دیکھا کہ گردونواح میں مسجد کا ایک

واں ہے اور عمارت پر لفظ "اللہ" لکھا ہوا ہے اور اگر ہندوؤں کو مندر بنانے کی اجازت دے دی جاتی تو کسی نہ کسی دن آپس میں فوج داری ہوگی اور ہزاروں لوگ مارے جائیں گے اور اس مرحلہ پر ایک مندر کی تعمیر کی اجازت دینا گویا فساد اور قتل کی بنیاد رکھنا ہے، اس لیے داد رسی کا جو مطالبہ کیا گیا ہے وہ نامنظور کیا جاتا ہے۔

(۶) مذکورہ فیصلہ مورخہ ۲۴ر دسمبر ۱۸۸۵ء کے خلاف ایک اپیل (سول اپیل نمبر ۱۸۸۶/۲۷ء) مہنت رگھوبیر داس نے سکریٹری آف اسٹیٹ اور دوسروں کے خلاف ڈسٹرکٹ جج فیض آباد کی عدالت میں داخل کی، ڈسٹرکٹ جج نے اپنے حکم مورخہ ۲۶ر مارچ ۱۸۸۶ء کے ذریعہ اس کو خارج کر دیا۔

(۷) ۱۹۳۴ء کے فرقہ وارانہ فساد میں مسجد کو نقصان پہنچایا گیا اور اس وقت حکومت یوپی نے اس کی مرمت کرائی۔

(۸) ۱۸۶۰ء کے مثل بندر جسٹر میں مذکورہ مسجد بہ حیثیت مسجد بابری کے درج کی گئی۔

(۹) وقف کمشنر کی ایک رپورٹ میں جو گورنمنٹ کے گزٹ مورخہ ۲۶ر فروری ۱۹۴۴ء میں شایع ہوئی، اس مسجد کو سنی وقف میں ہونا ظاہر کیا گیا۔

(۱۰) مذکورۂ بالا حقائق کی بنا پر یوپی سنی سنٹرل وقف بورڈ نے مذکورہ مسجد کو وقف نمبر ۲۶ فیض آباد یوپی مسلم وقف ایکٹ ۱۹۶۰ء کے تحت بہ حیثیت وقف درج کیا۔

(۱۱) ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء تک مسلمان اس مسجد میں پابندی سے نمازیں ادا کرتے رہے، اور یہ ۲۲/۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی شب تھی جب کہ ایک مسلم مخالف متعصب ہجوم نے بزور مسجد پر قبضہ کرلیا اور یہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر کے۔کے۔نائر کی چشم پوشی کی وجہ سے ہوا جن کو اس ناپاک واقعہ کے بعد مستعفی ہونا پڑا اور پھر شری رام چندر جی کی مورتیاں خفیہ طور سے مسجد میں رکھ دی گئیں اجودھیا پولیس اسٹیشن پر اس رات ڈیوٹی پر تعینات کانسٹبل شری ماتو پرشاد نے فوراً

ایف.آئی.آر. درج کرائی، اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ مورتیاں خفیہ طور پر مسجد کے اندر ۲۲/۲۳ دسمبر کی درمیانی رات میں رکھی گئیں۔(ایف.آئی.آر کی ایک کاپی ساتھ میں منسلک ہے)

(۱۲) ۲۳/دسمبر ۱۹۴۹ء کو فیض آباد اور اجودھیا میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کی گئی اور مسجد کو دفعہ ۱۴۵ کے تحت قرق کرلیا گیا۔

(۱۳) ۱۶/جنوری ۱۹۵۰ء کو گوپال سنگھ ویشارد نے فیض آباد کے منصف صدر کی عدالت میں مقدمہ نمبر ۲ پیش کیا، اس بات کی جانب توجہ دلانا مناسب ہوگا کہ مورخہ ۲۴/اپریل ۱۹۵۰ء کو مقدمہ نمبر ۲ میں ڈپٹی کمشنر فیض آباد شری جے.این.اوگرا کی جانب سے سول جج فیض آباد کی عدالت میں تحریری بیان داخل کیا گیا، جس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ شری رام چندر جی کی مورتیاں شرانگیزی سے مسجد کے اندر رکھ دی گئیں، اسی طرح اسٹیٹ گورنمنٹ کی جانب سے آر.ایس نمبر ۲۵/۱۹۵۰ء میں تحریری بیان داخل کیا گیا۔(اس میمورنڈم کے ساتھ ان دونوں بیانات کی کاپیاں منسلک ہیں)۔اسی طرح ایک اور مقدمہ نرموہی اکھاڑے کی جانب سے بھی داخل کیا گیا اور آخر میں ایک چوتھا مقدمہ یوپی سنٹرل وقف بورڈ لکھنؤ کی جانب سے ۱۹۶۱ء میں مقدمہ نمبر ۱۲ کی حیثیت سے داخل کیا گیا، یہ تمام چاروں مقدمات قائم ہوئے اور رجسٹرڈ مقدمہ نمبر ۱۲/۱۹۶۱ء جسے وقف بورڈ نے داخل کیا تھا، اس کو رہنما مقدمہ بنایا گیا۔

مذکورۂ بالا ان تمام بیانات سے جنہیں صوبائی حکومت نے داخل کیے، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صوبائی حکومت برابر مذکورہ عمارت کو بابری مسجد کی حیثیت سے شمار کرتی رہی، نہ کہ شری رام چندر کے مندر کی حیثیت سے۔

(۱۴) مسجد کے اہتمام (ریسیور شپ) سے متعلق معاملہ میں الٰہ آباد ہائی کورٹ نے رہنما مقدمہ نمبر ۱۲/۱۹۶۱ء کی فائل روک رکھی ہے اور یہ اب تک اسی عدالت کی لکھنؤ شاخ میں پڑی ہوئی ہے۔

(۱۵) ۲۵ر جنوری ۱۹۸۶ء کو اچانک ایک شخص امیش چندر پانڈے وکیل عدالت فیض آباد نے منصف صدر فیض آباد کی عدالت میں مقدمہ نمبر ۲ر ۱۹۵۰ء کے سلسلہ میں ایک درخواست دی جس کا منشا یہ تھا کہ ڈی ایم اور ایس پی فیض آباد کو ہدایت کی جائے کہ وہ متنازعہ جگہ سے تالے ہٹالیں تا کہ وہ اور ہندو فرقہ کے دوسرے افراد وہاں پوجا کر سکیں، ۲۸ر جنوری ۱۹۸۶ء کو فاضل منصف نے یہ حکم دیا کہ یہ درخواست مقررہ وقت پر دی جائے کیوں کہ مقدمہ کی فائل ہائی کورٹ میں پیش ہے۔

(۱۶) بہر حال منصف صدر کے مذکورہ فیصلہ کے خلاف ایک اپیل ۳۰ر جنوری ۱۹۸۶ء کو ڈسٹرکٹ جج کے سامنے پیش کی گئی، اس کی سماعت یکم فروری ۱۹۸۶ء کو ہوئی، اسی تاریخ کو چند مسلمانوں کو ان کارروائیوں کا علم ہوا تو انہوں نے ایک درخواست دی کہ مقدمہ کے ایک فریق کی حیثیت سے ان کی سماعت نہیں ہو رہی ہے، مقدمہ میں امیش چندر پانڈے نے کسی مسلمان کو فریق نہیں ٹھہرایا تھا، ان مسلمانوں نے جو اصل مقدمات میں پہلے سے ہی فریق تھے، انہوں نے بھی اس سماعت میں فریق بننے کے لیے تحریک کی، مگر یہ ساری درخواستیں ڈسٹرکٹ جج نے غیر منصفانہ طریقہ سے مسترد کر دیں اور بے محل طور پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس. پی کے بیانات لیے، ان لوگوں نے شرارت پسند لوگوں کی باتوں کو نظر انداز کر دیا، چنانچہ ان لوگوں کے ایسے غیر عقلی اور غیر جمہوری بیانوں کی بنیاد پر کہ مسجد کے تالے کھولے جانے صورت میں نظم وضبط کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا، ڈسٹرکٹ جج نے اپیل منظور کر لی اور ڈی. ایم اور ایس. پی کو ہدایت کی کہ وہ متنازعہ جگہ سے تالا ہٹا دیں، چنانچہ تالا اسی روز تقریباً سوا پانچ بجے شام کو توڑ دیا گیا۔

(۱۷) اس کی طرف توجہ دلانا بھی برمحل ہوگا کہ یہ حکم جسے مسلمانوں کو نظر انداز کر کے سازش کر کے حاصل کیا گیا ہے، مندرجہ ذیل نقائص پر مبنی ہے:

ا۔ مدعی جس نے یہ اپیل داخل کی وہ گذشتہ مقدمات میں کبھی ایک فریق نہیں رہا،

اس طرح اسے عدالت میں حاضر ہونے کا مسلمہ حق ہی نہیں۔

۲۔ وہ مسلمان جو گذشتہ اصل مقدمات میں فریق تھے اور جنہوں نے اس مقدمہ میں فریق بنائے جانے کی درخواست بھی کی تھی، ان کو سماعت کا موقع نہیں دیا گیا۔

۳۔ اپیلوں پر بھی بیانات ریکارڈ نہیں کیے جاتے ہیں، جیسا کہ اس ڈسٹرکٹ جج نے غلط طور پر کیا۔

۴۔ منصف صدر کا جاری کردہ بیان اپیل کے لائق نہیں تھا، کیوں کہ اس نے اس وقت تک خود کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

۵۔ اپیل کی سماعت ڈسٹرکٹ جج نے کی اور یک طرفہ احکام کیے گئے اور اسی دن ان کا نفاذ بھی کر دیا گیا۔

۶۔ اور سب سے بڑھ کر ایسا کوئی حکم نافذ کیا ہی نہیں جا سکتا، جب کہ اصل مقدمہ کی فائل الٰہ آباد ہائی کورٹ (لکھنؤ شاخ) میں پڑی ہو۔

(۱۸) ڈسٹرکٹ جج کے فیصلہ نے موجودہ صورت حال کو پیدا کیا کہ بلوے فسادات میں ملک کے بہت سے حصوں میں کرفیو کا نفاذ ہے اور اجتماعی گرفتاریاں ہیں، اس حکم نے ایسی صورت حال کو پیدا کیا جس میں مسلمانوں کا عدالتی نظام پر بھروسہ اور اعتماد ہل کر رہ گیا ہے۔

(۱۹) ہم یہ شکوہ کرنے پر بھی مجبور ہیں کہ نیشنل ٹیلی ویژن کو بھی اس تنازعہ میں ایک فریق متصور کریں، کیوں کہ اس نے مسجد میں ہندو پجاریوں کے داخلہ کو ٹیلی ویژن پر دکھایا اور متنازعہ جگہ کو رام جنم بھومی کہہ کر ظاہر کیا، آل انڈیا ریڈیو نے بھی یہی رویہ اختیار کیا۔

(۲۰) مسلمانوں کے پر امن اور جمہوری احتجاج کو ہندو اکثریتی فرقہ نے برا مانا اور ان کو اس سلسلہ میں نظم وضبط کے انتظامیہ سے عملی تعاون حاصل رہا۔

(۲۱) جس چیز نے ہم کو سب سے زیادہ دکھ دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ قدریں جو

ہندوستان کے سیکولر اور جمہوری طریقہ زندگی کو واقعۃً برقرار رکھ کر متمول کر سکتی ہیں وہ تیزی سے پستی میں جا رہی ہیں، اگر ہندوستان کو مضبوط اور متحد رہنا ہے تو کچھ نہ کچھ فوری طور پر کیے جانے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلہ میں، ہم محترم وزیر اعظم کی توجہ میں ایک مجاہد آزادی اور فیض آباد کے سینیر کانگریسی لیڈر جناب اکشے برہمچاری کی وہ پرزور فریاد بھی لانا چاہتے ہیں، جس نے اس وقت کے یو پی کے وزیر داخلہ شری لال بہادر شاستری کی توجہ اپنی جانب مبذول کی تھی، اس میں چند ہندو مفسدوں کی چیرہ دستی اور غارت گری کی جانب اشارہ تھا، جو بابری مسجد کو بزور مندر میں بدل دینا چاہتے تھے، شری اکشے برہمچاری کی یہ فریاد راہ فرض پر کے نام سے میمورنڈم کے ساتھ منسلک ہے۔

اس پس منظر میں ہم مسلمان ممبران پارلیمنٹ آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ براہِ کرم مندرجہ ذیل مطالبات کے لیے مناسب قدم اٹھائیں:

(۱) یہ کہ آپ براہِ مہربانی اس معاملہ میں فوری مداخلت کریں اور مسلمانوں کے لیے بابری مسجد کی بازیابی کے لیے فوری اقدام کریں۔

(۲) یہ کہ ایک رٹ پٹیشن حکومت یو پی کی جانب سے ہائی کورٹ میں داخل کی جائے جو اس فیصلہ کے خلاف ہو جسے فیض آباد کے ڈسٹرکٹ جج نے یکم فروری ۱۹۸۶ء کو صادر کیا ہے۔

(۳) یہ کہ ڈسٹرکٹ جج نے خود اپنے فیصلہ مؤرخہ یکم فروری میں یہ تسلیم کیا ہے کہ انتظامیہ نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کے لیے کوئی بھی آزادانہ قدم اٹھا سکتی ہے، اس لیے بابری مسجد کی جو صورت حال ۳۱ جنوری ۱۹۸۶ء سے پہلے تھی وہ برقرار کر دی جائے۔

(۴) متنازعہ جگہ سے متعلق تمام غیر فیصلہ شدہ مقدمات کو چھ مہینوں میں فیصل کر دیا جائے۔

(۵) مختلف پارٹیوں کے نمایندہ ممبران پارلیمنٹ کا ایک وفد اجودھیا جا کر بابری

مسجد کا معائنہ کرے، اس وفد کو ایسی سہولتیں فراہم کی جائیں کہ وہ متنازعہ جگہ کا ایک نقشہ تیار کرے اور مسجد کے فوٹو بھی لے تا کہ مسجد کی واقعی جائے وقوع کے ریکارڈ میں وہ درج ہوں۔

(۶) سرکاری وسائل و ذرائع ابلاغ کو یہ ہدایت کی جائے کہ وہ متنازعہ جگہ کو رام جنم بھومی کے نام سے نہ ذکر کریں۔

اس میمورنڈم پر لوک سبھا کے حسب ذیل ممبروں کے دستخط ہیں:

(۱) قاضی جلیل عباسی (۲) اکبر جہاں بیگم (۳) سرفراز احمد (۴) عابدہ احمد (۵) اختر حسن (۶) عبدالحنان انصاری (۷) ابراہیم سلیمان سیٹھ (۸) غلام محمود بنات والا (۹) بشیر بٹ (۱۰) حسین دلوائی (۱۱) عبدالرشید کابلی (۱۲) اسلم شیر خان (۱۳) محمد ایوب خان (۱۴) محفوظ علی خان (۱۵) چودھری رحیم خان (۱۶) ذوالفقار علی خان (۱۷) سید شہاب الدین (۱۸) صلاح الدین اویسی (۱۹) فقیر محمد ای۔ ایس۔ ایم (۲۰) احمد پٹیل (۲۱) عزیز قریشی (۲۲) صلاح الدین (۲۳) پی۔ ایم۔ سعید (۲۴) حافظ محمد صدیق (۲۵) سیف الدین سوز (۲۶) طارق انور (۲۷) غلام یزدانی (۲۸) زین البشر

اور راجیہ سبھی کے مندرجہ ذیل ممبروں کے بھی دستخط ہیں:

(۲۹) سید ہاشم رضا عابدی (۳۰) حیات اللہ انصاری (۳۱) اسرار الحق (۳۲) محمد ہاشم قدوائی (۳۳) ایف۔ ایم خان (۳۴) بی۔ وی۔ عبداللہ کویا (۳۵) اسعد مدنی (۳۶) غلام رسول ماٹو (۳۷) مرزا ارشاد بیگ (۳۸) رفیق عالم (۳۹) غلام محی الدین شال (۴۰) شمیم احمد صدیقی (۴۱) راؤ ولی اللہ۔

احتجاجی مظاہرے: بابری مسجد کو مندر بنا دینے پر پورے ملک میں مسلمانوں میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی، ان میں ایسا جوش وخروش ابل پڑا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بابری مسجد کی بازیابی کے لیے ہرقسم کی جانی و مالی قربانی دیں گے، ۳۰ راپریل ۱۹۸۶ء کو یوم احتجاج منایا گیا، تو ہزاروں کی تعداد میں مسلمان گھروں سے جیل جانے کے لیے نکل پڑے، بارہ بنکی میں تو مسلمانوں اور پولیس والوں میں خوں ریز تصادم ہوگیا، جس میں تیرہ چودہ افراد گولیوں کا نشانہ بنے، اس سے پورے ملک کی فضا اور بھی مکدر ہوگئی، پیلی بھیت میں بھی ایسا ہی سانحہ پیش آیا، حکومت نے ان شہیدوں کے معاوضے دے کر ان کے پس ماندگان کی دل جوئی کرنے کی کوشش کی، مگر یہاں یہ واقعہ لکھنے کے قابل ہے کہ بارہ بنکی کی ایک بوڑھی عورت کے ایک جوان لڑکے کے مارے جانے پر حکومت کی طرف سے اس کا معاوضہ دیا جانے لگا تو اس نے کہا کہ کاش میرے اور لڑکے ہوتے جو اس مسجد کے لیے شہید ہو جاتے، تم اپنا معاوضہ واپس لے جاؤ، یا تو میرے لڑکے کو لا کر دو، یا بابری مسجد واپس کرو، یو. پی کی حکومت کی طرف سے یہ بیان شائع ہوا ہے کہ فروری سے اگست ۱۹۸۶ء کے اوائل تک اس ریاست میں اسی بابری مسجد کے سلسلہ میں ۴۵ ہندو مسلمان بلوے ہو چکے ہیں، جن میں پانچ بہت بڑے تھے، یہ بیان بی. بی. سی سے بھی براڈ کاسٹ ہوا۔

ہندوؤں کی تنظیموں کے عزائم: ہندو پریشد ایک جنگجویانہ تنظیم کی بنا پڑی ہے، پھر دھرم استھان مکتی بھی قائم ہوئی جس کا مقصد یہ ہے کہ کاشی، متھرا اور اجودھیا اور ہندوؤں کے بڑے اور اہم مندر جنہیں بیرونی حملہ آوروں نے تاراج کیا تھا، وہ اب ہندوؤں کے سپرد کیے جائیں اور پھر بجرنگ دل اس لیے قائم کیا گیا کہ جب تک رام کا نام پورا نہ ہو جائے، یہ دل چین سے نہ بیٹھے۔

مسجد شکنی کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے: اس طرح اگر بابری مسجد کا قضیہ صرف اس

لیے اٹھایا گیا ہے کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ مسلمان اپنے دور حکومت میں صرف مندروں کو منہدم کرتے رہے، تو پھر یہ لکھنے میں بالکل تامل نہیں کہ ہندوستانی سیاست دانوں کا نہیں بلکہ مؤرخوں کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو یہ جائزہ لے کہ ہندوستان میں جب سے مسلمان آئے اس وقت سے اب تک مسلمانوں نے کتنے مندر منہدم کیے اور ہندوؤں نے کتنی مسجدیں شہید کیں، دونوں کے اعداد و شمار سے یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ کون زیادہ قصوروار ہے۔

اب تو صاف اور غیر متعصب ذہن رکھنے والے ہندو مؤرخین اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں جو مندر منہدم کیے گئے وہ یا تو سرکشی کے مرکز یا معصیت کے اڈے تھے، ڈاکٹر ایشور ٹوپا نے اپنی کتاب 'پالی ٹکس ان پری مغل ٹائمس' میں لکھا ہے کہ فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں بعض مندر بداخلاقی کے اڈے تھے، ان کے میلوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے، عورتیں بھی وہاں آتی تھیں اس لیے مندر عبادت گاہ کے بجائے شیطنت کے مرکز بن گئے تھے، فیروز شاہ تغلق نے اسلامی اور اخلاقی جذبہ کے تحت ان مخرب اخلاق اڈوں کو منہدم کرا دیا، یہ ایک الگ سوال ہے کہ فیروز شاہ کو عوام کی بداخلاقی دور کرنے کا حق تھا یا نہیں؟ مگر حقیقت یہ ہے کہ فیروز شاہ نے جو کچھ کیا اس میں مذہبی جنون کو دخل نہ تھا بلکہ عوام کے اخلاق کو سنوارنے کے لیے ایسا کیا، اگر اس میں مندروں کو منہدم کرنے کا جذبہ ہوتا تو ہندوستان کے سارے مندروں کو برباد کرا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، ذمیوں کے حقوق کی بنا پر تمام مندر محفوظ رہے۔ (ص ۲۴۷)

اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں جو مندر مسلمانوں کے عہد میں منہدم کیے گئے وہ اس لیے نہیں کہ یہ ہندوؤں کی عبادت گاہیں تھیں بلکہ اس کے اسباب کچھ اور تھے جن کا تجزیہ غیر متعصبانہ انداز سے کرنے کی ضرورت ہے، اورنگ زیب مندر شکنی کا سب سے بڑا مجرم قرار دیا جاتا ہے، برطانوی حکومت کے اشارے سے جدوناتھ سرکار نے اورنگ زیب

پر جو پانچ جلدیں لکھیں ہیں، ان میں اس کی مندر شکنی کی تفصیل پورے زور بیان کے ساتھ لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اس نے اپنی شاہزادگی اور بادشاہت کے زمانہ میں سارس بور، چنتامن، احمد آباد، اورنگ آباد کے گاؤں ستارا، سوم ناتھ بنارس کے وشوناتھ، متھرا کے کیسو رائے مندر اور اجین کے مندر کو منہدم کرایا، ان کی گنتی کی جائے تو ان کی تعداد بارہ تیرہ سے زیادہ نہیں ہوتی، ان مندروں کے انہدام کا ذکر جدوناتھ سرکار اس طرح کرتے ہیں جیسے اورنگ زیب نے پورے ہندوستان کے مندروں کو منہدم کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا، مگر اس نے اپنی راجدھانی آگرہ اور دہلی کے کسی مندر کو منہدم نہیں کیا اور حیرت تو یہ پڑھ کر ہوتی ہے کہ وہ پچیس برس تک دکن میں رہا اور وہاں اجنتا اور الورا ہیں، جو اس کی آخری آرام گاہ سے میل دو میل پر واقع ہیں، ان کو اس نے مسمار نہیں کیا، بلکہ اس کا درباری مؤرخ اور مآثر عالم گیری کا مصنف ان کو نظر فریب سیر گاہیں کہہ کر ان کی تعریف کرتا ہے، (مآثر عالم گیری ص ۳۳۸) اورنگ زیب نے جن مندروں کو منہدم کیا اس کے اسباب کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے، ڈاکٹر بی. این. پانڈے جو آج کل اڑیسہ کے گورنر ہیں، ان کی نظر ہندوستان کی تاریخ پر بڑی اچھی ہے، اورنگ زیب نے بلاشبہہ وارانسی کے وشوناتھ مندر کو منہدم کرایا، اس انہدام کی نوعیت کی وضاحت جناب بی. این. پانڈے نے ۲۴ر جولائی ۱۹۷۷ء میں راجیہ سبھا کی ایک تقریر میں اس طرح کی، کہ اورنگ زیب بنگال جارہا تھا تو وارانسی کے پاس سے بھی گذرا، اس کے جلو میں ہندو راجے بھی تھے، انہوں نے اورنگ زیب سے درخواست کی کہ یہاں ایک روز قیام کیا جائے، تاکہ ان کی رانیاں وارانسی جاکر گنگا میں اشنان اور وشوناتھ جی کی پوجا کرسکیں، فوجی کیمپ سے وارانسی پانچ میل دور تھا اورنگ زیب کے حکم سے فوج متعین کر دی گئی، رانیاں پالکیوں میں روانہ ہوئیں، انہوں نے گنگا میں اشنان کیا اور وشوناتھ مندر میں پوجا کے لیے گئیں اور رانیاں واپس آگئیں، مگر کچھ کی مہارانی لاپتہ تھی، ہر طرف اس کی تلاش

ہوئی کہیں نہیں ملی، اس گم شدگی پر اورنگ زیب بہت برہم ہوا، اس نے مہارانی کی تلاش میں اپنے اونچے عہدے داروں کو مندر کے اندر بھیجا، انہوں نے دیکھا کہ اس میں گنیش جی کی مورتی دیوار میں نصب ہے لیکن اس میں حرکت ہوتی رہتی ہے، مورتی اپنی جگہ سے ہٹائی گئی تو اس کے نیچے زینے ایک تہ خانہ کے اندر جاتے تھے، لوگوں کے تعجب کی انتہا نہ رہی، جب انہوں نے مہارانی کو اس تہہ خانہ میں پایا، اس کی عصمت ریزی ہو چکی تھی اور وہ رو رہی تھی، راجاؤں نے اورنگ زیب سے فریاد کی، بڑا اہم مسئلہ تھا، اورنگ زیب نے حکم دیا کہ یہ پوترا احاطہ ناپاک کر دیا گیا ہے، وشوناتھ کی مورتی تو کسی اور جگہ منتقل کر دی جائے لیکن مندر مسمار کر دیا جائے اور مہنت کو گرفتار کر کے سزا دی جائے، ڈاکٹر پٹابی سیتارامیہ نے اپنی مشہور کتاب دی فیڈرس اینڈ اسٹونس میں اس واقعہ کو پوری سند کے ساتھ لکھا ہے، اور ڈاکٹر پی. ایل. گپتا نے بھی جو پٹنہ میوزیم کے کیوریٹر رہ چکے ہیں اس واقعہ کو دہرایا ہے، اورنگ زیب پر یہ تو الزام رکھا جاتا ہے کہ اس نے مندروں کا انہدام کیا، مگر ڈاکٹر بی. این. پانڈے ہی نے اس کی طرف توجہ دلائی کہ اس نے مہاکلیشور، اجین، بالا جی مندر، چتر کوٹ، اومانند گوہاٹی، شررن جے کے جین مندروں اور اسی طرح شمالی ہند کے دوسو مندروں اور گرودواروں کو جاگیریں دیں، اس کے ایسے فرامین کی نقلیں ان کے پاس موجود ہیں، اس نے جتنے مندر منہدم کیے ان کے اسباب اسی قسم کے تھے، جیسے کہ وشوناتھ مندر کے تھے، یا وہ سازشوں، بغاوتوں اور دوسرے جرائم کے مرکز بن گئے تھے،

پھر جب مندر شکنی کا ذکر ہو تو مسجد شکنی کا بھی ذکر ضرور آنا چاہیے کہ خود ہندوؤں نے کتنی مسجدیں شہید کیں، جہانگیر اور شاہجہاں کے عروج کے زمانہ میں گجرات میں ہندوؤں نے جابجا مسجدوں کو توڑ کر ان کی جگہوں پر اپنے گھر بنا لیے تھے، (بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری ج ۲ ص ۵۷) علی عادل شاہ نے ۹۷۶ھ میں بیجانگر کے راجہ رام کو نظام شاہ

بحری کے خلاف اپنی مدد کے لیے بلایا تو رام راج نے علی نے عادل شاہ کے قلمرو کی تمام مسجدیں جلادیں (تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۶ لکھنؤ ایڈیشن) خود جدوناتھ سرکار نے اعتراف کیا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں ست نامیوں نے نارنول کو لوٹ کر اس کی تمام مسجدیں منہدم کردیں، (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۲ ص ۳۹۶) اورنگ زیب ہی کے عہد میں بھیم سنگھ نے گجرات میں سو مسجدوں کو جلادیا (اورنگ زیب، از ظہیر الدین فاروقی، ص ۱۳۴) اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ اول کی وفات کے بعد جودھ پور کے راجہ جسونت سنگھ کے لڑکے اجیت سنگھ نے جودھ پور کی مسجدیں شہید کر کے ان کی جگہوں پر مندر بنوائے (منتخب اللباب، از خافی خاں، ج ۲، ص ۲۳۱) اسی کتاب میں گذشتہ اوراق میں ذکر آیا ہے کہ اجودھیا میں ہندوؤں نے تین مسجدیں مسمار کردیں، سکھوں نے اپنی حکومت کے زمانے میں جو ہزاروں مسجدیں برباد کیں، اس کی داستان الگ ہے (تفصیل کے لیے تاریخ لاہور از کنہیا لال کپور ص ۱۵۱۔۱۳۵ دیکھی جاسکتی ہے) ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں مسجدوں کی جو بے حرمتی اور بربادی کی گئی، اس کی النا کی اب بھی آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہے، ۱۹۷۶ء میں حکومت ہند نے برنی کمیٹی مقرر کی تھی، اس کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ اس وقت تک صرف دہلی کی تقریباً ایک سو چھہتر مسجدیں ایسی تھیں جن کے تصرف سے مسلمان محروم تھے، ان پر یا تو حکومت یا ہندوؤں کا قبضہ تھا اور اب تک واگذاشت نہیں ہو سکی ہیں، دہلی مسلمان بادشاہوں کا بھی دارالسلطنت رہا لیکن کسی مستند حوالہ سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہاں ایک سو چھہتر مندروں کے تصرف سے ہندو محروم کردیے گئے تھے، ۱۹۷۹ء میں مغربی بنگال اسمبلی میں ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ صرف کلکتہ میں انسٹھ مسجدیں ایسی ہیں جن کے قبضہ سے مسلمان نہ صرف محروم ہیں بلکہ ان پر ہندوؤں کا تصرف ہے اور بعض مسجدوں کو گوبر سے لیپا جاتا ہے، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی کسی تاریخ سے یہ

پتہ نہیں چلایا جاسکتا ہے کہ صرف ایک شہر کے انسٹھ مندروں کی ایسی بے حرمتی کی گئی اور اخباروں میں برابر ذکر آیا ہے کہ دہلی سے پاکستان کی سرحد تک نو ہزار مسجدیں ایسی ہیں جو غیر مسلموں کے تسلط میں ہیں۔

مسلمانوں کی مذہبی رواداری: مسلمانوں کے دور حکومت میں البیرونی نے اپنی کتاب الہند اور ابوالفضل نے اپنی آئین اکبری میں ہندو مذہب کو جس ہمدردی، رواداری اور فراخ دلی سے سمجھایا ہے، پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آج تک کسی ہندو اسکالر نے اسلام کو اس ہمدردی، فراخ دلی اور رواداری سے نہیں سمجھایا بلکہ مذہبی حیثیت سے اس پر کچھ نہ کچھ الزام رکھ دینے میں ہندو دانشوروں کو ذہنی لذت ملتی ہے، خود راماین اور رام چندر سے مسلمانوں نے بڑی دلچسپی لی۔

مسلمانوں میں رامائن اور رام چندر کا احترام: اکبر نے اپنے زمانہ میں راماین کا ترجمہ فارسی میں کرایا، اس کی تفصیل خود راقم نے اپنی کتاب بزم تیموریہ جلد اول میں اس طرح لکھی ہے:

"۹۹۲ھ یعنی ۱۵۸۴ء میں ملا عبدالقادر بدایونی نے شاہی حکم کے بموجب رامائن کا ترجمہ شروع کیا، اور ۹۹۶ھ یعنی ۱۵۸۷ء میں تمام کیا، ملا صاحب رامائن کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں پچیس ہزار اشلوک ہیں، ہر اشلوک ۶۵ حرفوں کا ایک فقرہ ہے، اس میں اودھ کے رام چندر کا قصہ ہے، جن کو رام بھی کہا جاتا ہے، ہندوان کو اوتار سمجھ کر پرستش کرتے ہیں، اس قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ رام چندر کی بی بی سیتا تھیں، جن پر جزیرہ لنکا کا راجہ فریفتہ ہو گیا، اس کے دس سر تھے، رام چندر نے اپنے بھائی لچھمن کے ساتھ اس جزیرہ پر حملہ کیا، انہوں نے اپنے لشکر میں بے شمار بندر اور

اتنے ریچھ جمع کیے کہ ان کا حساب وہم میں بھی نہیں آسکتا ہے اور سمندر پر چار کوس کا ایک پل بندھوایا، کہا جاتا ہے کہ بعض بندروں نے ایک جست میں سمندر کو پار کیا اور بعض بندر ایسے تھے، جو سمندر پر چل کر پار ہوئے، رام چندر ایک بندر پر سوار ہو کر پل سے پار ہوئے، ایک ہفتہ جنگ کر کے رام چندر نے راون اور اس کی اولاد کو قتل کیا، اس طرح ہزار سال کے ایک خاندان کو برباد کر دیا، لنکا کو راون کے بھائی کے سپرد کر کے واپس آگئے، ہندوؤں کا خیال ہے کہ رام نے سارے ہندوستان پر دس ہزار سال تک حکومت کرنے کے بعد وفات پائی، ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ دنیا قدیم ہے، کوئی جگہ انسان سے خالی نہیں ہے، دنیا پر لاکھوں سال گذر چکے ہیں، وہ آدم کو ابوالبشر کہتے ہیں، جن کو گذرے ہوئے سات ہزار سال ہو چکے، ملا صاحب نے چار سال میں اس کا ترجمہ کر کے اکبر کی خدمت میں پیش کیا تو اس کے آخر میں یہ لکھ دیا۔

ما قصہ نوشتیم بہ سلطاں کہ رساند جان سوختہ کردیم بہ جاناں کہ رساند

یعنی ہم نے قصہ لکھ کر سلطان تک پہنچا دیا۔

اکبر کو یہ شعر بہت پسند آیا اس نے پوچھا کہ یہ کتنے جزء میں مکمل ہوا، تو ملا صاحب نے بتایا کہ پہلی بار اختصار کے ساتھ تقریباً ستر جزء اور دوسری بار تفصیل کے ساتھ ایک سو بیس جزء میں تمام ہوا، اکبر نے مصنفوں کے دستور کے مطابق ملا صاحب سے اس پر دیباچہ لکھنے کی بھی فرمائش کی لیکن انہوں نے اس کے لکھنے سے اغماض کیا، پھر بھی اکبر نے ان کو شال اور گھوڑا انعام میں عطا کیا، مدد معاش کے لیے فرمان بھی جاری کرنے کو کہا، اس ترجمہ کے نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، (بزم تیموریہ ج ۱ص ۱۷۵-۱۱۳)

جہانگیر کے زمانہ میں ملا مسیح نے خود فارسی میں ایک منظوم رامائن لکھی، بزرگان دین میں مرزا مظہر جان جاناں کرشن اور رام چندر دونوں کو مقدس شخصیتیں مانتے تھے اور اس کی ہدایت اپنے مریدوں کو دیتے تھے جیسا کہ حسب ذیل واقعہ سے ظاہر ہوگا، ایک روز مرزا صاحب کے سامنے کسی خواب کا ذکر آیا، کہ ایک صحرا ہے جس میں آگ جل رہی ہے، کرشن اس آگ میں اور رام چندر کنارے پر کھڑے ہیں، مرزا صاحب نے اس خواب کی تعبیر دی کہ صحرا کی آگ عشق و محبت کی حرارت ہے، کرشن کی زندگی عشق و محبت کی زندگی تھی، اس لیے آگ کے اندر دکھائی دیئے اور رام چندر کی زندگی تیاگ اور ایثار کی زندگی تھی، اس لیے راہ سلوک میں کنارے کھڑے نظر آئے، پھر فرمایا کہ قرآن میں ہے کہ ہر قریہ میں ایک ڈرانے والا آیا، اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں بھی کوئی ضرور آیا ہوگا، ممکن ہے کہ رام چندر اور کرشن نبی رہے ہوں، رام چندر ابتدائی عہد میں دنیا میں بھیجے گئے، جب کہ لوگوں کی عمریں دراز اور ان میں طاقت اور توانائی زیادہ ہوتی، اس لئے انہوں نے لوگوں کی تربیت سلوک کے طریقہ کے مطابق کی (ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص ۲۶۰)۔

علامہ محمد اقبال کی خواہش تھی کہ وہ رامائن کے خاص خاص واقعات کو اپنی شاعری میں منظوم کرلیں، وہ ایسا تو نہ کرسکے مگر رام چندر پر یہ نظم لکھ گئے ہیں:

لبریز ہے شراب حقیقت سے جامِ ہند — سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رام ہند
یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے اثر — رفعت میں آسمان سے بھی اونچا ہے بامِ ہند
اس دیس میں ہوتے ہیں ہزاروں ملک سرشت — مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز — اہل نظر سمجھتے تھے اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی — روشن تر از سحر ہے زمانہ میں شامِ ہند

تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوش محبت میں فرد تھا

رام اور رامائن کے بعض ہندو نقاد: رام پر اس سے بہتر نظم موجودہ ہندی زبان میں شاید نہ لکھی گئی ہو، مگر عجیب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اب کچھ ایسے ہندو اہل قلم بھی پیدا ہو گئے ہیں جو رام کی شخصیت، رامائن کی نوعیت اور خود اجودھیا کے وجود پر ایسے ایسے مضامین لکھ رہے ہیں جن سے ان کا روایتی تقدس اور ان کے ساتھ جو جذباتی لگاؤ ہے وہ مجروح ہو رہا ہے اور طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا ہو رہے ہیں۔

رام چندر جی کی شخصیت اور اہمیت رامائن ہی سے متعین ہوتی ہے، اس سے پہلے ان کا ذکر کہیں اور نہیں آتا، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رامائن کب اور کیسے لکھی گئی، آج سے ۴۹ برس پہلے دارالمصنفین کے رسالہ معارف میں اس پر بحث چھڑی تھی، رامائن کا تجزیہ کرتے ہوئے راج مندری (دکن) کے مسٹر ملادی وین کٹارتنام سابق وائس چانسلر گورنمنٹ ٹریننگ کالج راج مندری نے ایک کتاب ''رام مصر کا فرعون'' کے نام سے لکھی ہے، اس میں انہوں نے ایسی باتوں کا انکشاف کیا ہے جن کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، ان کا خیال ہے کہ رامائن ایک مصری فرعون رامیز ثانی کے قصہ سے ماخوذ ہے، خود رام کا نام ہندی الاصل نہیں، بلکہ سامی الاصل ہے، سیریا کے ایک بادشاہ کا یہی نام تھا، رامائن کا دوسرا زبردست کردار سیتا جی ہیں، رامائن کا بیان ہے کہ یہ نام اس لیے پسند کیا گیا تھا کہ جنک نے ہل چلاتے وقت ان کو پایا تھا، بالفاظ دیگر وہ کسی عورت کے بطن سے پیدا نہ ہوئی تھیں بلکہ وہ دھرتی ماتا کی اولاد تھیں لیکن سیتا ایک بہت ہی قدیم مصری نام ہے، وہاں اب بھی دولت مند خواتین کے نام کے ساتھ عزت اور ادب کے لحاظ سے اس کو لگا دیا جاتا ہے، قاہرہ میں آج بھی ایک مسجد سیتا زینب کہلاتی ہے، وین کٹارتنام نے اسی طرح رامائن کے اور ناموں کی تطبیق مصری

ناموں سے کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم آثار میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی جس سے ثابت کیا جائے کہ رام چندر جی نے کسی خطہ پر حکومت کی، یہ ایک مصری کہانی ہے جس کو ہندوؤں کے مزاج کے مطابق ایک مقدس رنگ دے دیا گیا ہے، یہ خیال کہاں تک صحیح ہے، اس سے ہم کو بحث نہیں، مگر ملادی وین کٹارتنام نے اس کی تصنیف کا جو زمانہ متعین کیا ہے اس سے ضرور دلچسپی ہے۔

وین کٹارتنام کا دعویٰ ہے کہ راماین میں بودھ مت کے حوالے اکثر جگہ موجود ہیں، مثلاً جب رام اور لکشمن وشوامتر رشی کے ساتھ راکششوں کو قتل کرنے جارہے تھے اور متھلا پہنچے تو گوتم کے سب سے بڑے بیٹے ستانند سے ملاقات ہوئی، اس کے معنی یہ ہوئے کہ رام چندر جی گوتم بدھ کے بعد ہوئے، کیا یہ صحیح ہے؟ یا راماین کی یہ روایت صحیح نہیں ہے، اگر اس میں گوتم بدھ کے لڑکے کا ذکر ہے تو یہ تصنیف چھٹی صدی عیسوی کی قرار دی جاسکتی ہے اور اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ رام چندر جی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ڈھائی ہزار سال پہلے پیدا ہوئے تو پھر راماین ان کے تین ہزار سال کے بعد لکھی گئی، جو کتاب کسی معاصر ماخذ یا مستند اثری اور کتبی شہادتوں کے بغیر قلم بند ہوتی ہے اس میں سنی سنائی ہوئی روایتوں کا سہارا زیادہ ہوتا ہے جس میں مؤرخوں کے نزدیک تاریخیت نہیں ہوتی۔

وین کٹارتنام لکھتے ہیں کہ خود راماین میں ہے کہ نرد پہلا شخص ہے جس نے بالمیک کو یہ افسانہ سنایا اس میں اس نے کیسی رنگ آمیزی کی اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بالمیک ہندو نہ تھا، کوئی بدیسی نووارد تھا، راماین میں یہ بھی ہے کہ نرد برہما کا بیٹا تھا جس کو رام کا قصہ سنانے کے لیے برہما نے بالمیک کے پاس آسمان سے بھیجا جس کے بعد وہ پھر آسمان کی طرف چلا گیا، مگر راماین میں ایک جگہ یہ بھی ہے کہ چترکوٹ میں بالمیک اور رام چندر کی ملاقات ہوئی، رام چندر جی نے اپنا جو قصہ سنایا اسی کو بالمیک نے قلم بند

کردیا، وین کٹارتنام لکھتے ہیں کہ اس تضاد کا اندازہ خود مؤرخین کرسکتے ہیں، وین کٹارتنام جو چاہیں لکھیں، مگر ہندو رامائن کو ایک آسمانی صحیفہ سمجھتے ہیں، تو ہم کو ان کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہوئے اس پر زیادہ بحث کرنے کا حق نہیں۔

رامائن میں جو عجیب وغریب واقعات لکھے گئے ہیں، وین کٹارتنام نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے، وہ لکھتے ہیں "بال کھنڈ میں سیتا اور رام کی شادی کے وقت جو نسب نامہ دیا گیا ہے وہ یہ کہ وشنو سے برہما جی پیدا ہوئے، برہما کے لڑکے اکش وشو تھے، اکش وشو کے بیٹے دسرتھ تھے، جو رام چندر جی کے باپ تھے، دسرتھ نے ساٹھ ہزار سال تک حکومت کی اور رام چندر جی گیارہ ہزار برس تک تخت نشین رہے، راون کے دس سر تھے، رام کا حریف ومقابل راون تھا، جو رامائن کے تمام افراد میں سب سے زیادہ عجیب وغریب ہے، کیوں کہ وہ ایک برہمن اور ویدوں کا مفسر بھی بتایا جاتا ہے، راون کا ماخذ سنسکرت کا لفظ 'راو' بتایا گیا ہے جس کے معنی ہیں، چلانا یا پکارنا، اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ راون اور شیو میں جنگ ہوئی، راون نے اس پہاڑ کو جس پر شیو جی بیٹھے ہوئے تھے، اکھاڑ کر آسمان کی طرف پھینک دیا، شیو جی نے غصہ میں پاؤں کے انگوٹھے سے پہاڑ کو دبایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ پھر زمین پر آگیا اور راون کا ہاتھ اس کے نیچے دب گیا اور وہ چلانے لگا اور آخر شیو جی نے ترس کھا کر راون کا ہاتھ نکال دیا، اس وقت سے راون شیو جی کا معتقد ہوگیا اور جب ہی سے راون کہلایا، دس کنٹھ اور دس گریو اس کا لقب ہے، کیوں کہ رامائن کے مطابق وہ دس سروں والا انسان تھا، اور جب رام چندر جی سے جنگ ہو رہی تھی تو اس کا ایک سر کٹنے کے بعد اس کی جگہ نیا سر پیدا ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ رام چندر کی تلوار نے ایک سو ایک سر کاٹ ڈالے۔ اس لڑائی کے ذکر میں ہے کہ بندروں نے رام چندر جی کی حمایت کی، وہ ہمالیہ سے پتھر لاتے تھے اور آسمان تک لے جاتے تھے اور سمندر کو ایک جست میں پھاند جاتے تھے، ایسے تمام

واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے وین کٹارتنام لکھتے ہیں کہ یہ خلاف عقل بیانات شاعرانہ تخیل کے لیے تو جائز سمجھے جاسکتے ہیں لیکن تاریخ کیا افسانہ کے معیار سے بھی گر جاتے ہیں، پھر اپنی طرف سے یہ کہتا ہے کہ جب ہندوان باتوں کو سچ سمجھ کران پر مذہبی اعتقاد رکھتے ہیں تو ہمارے لیے اس پر جرح وقدح کی گنجائش نہیں، البتہ اس کی طرف خیال ضرور جاتا ہے کہ اگر راماین کے مطابق راجہ دسرتھ اور رام چندر جی کی حکومت اکہتر ہزار سال رہی تو پھر عام روایت جو یہ ہے کہ ان کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پچیس ہزار سال پہلے تھا، تو دونوں کی حکومت کو سامنے رکھتے ہوئے ان کا عہد حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چھیانوے ہزار سال پہلے رکھنا ہوگا۔

وین کٹارتنام یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے آثار الصنادید بھی کوئی ایسی چیز نہیں پیش کرسکتے جس کو رام چندر جی کی یادگار کہا جاسکے، چتر کوٹ، رام ٹیک، پنچ وتی، غرض تمام ایسے مقامات پر جن کو رام کے گذرگاہ ہونے یا قیام کا شرف حاصل ہوا ہے، سوائے ان مندروں کے جو عقیدت مندوں نے بعد میں تعمیر کردیے ہیں، بلکہ اکثر مقامات کا وقوع بھی مشتبہ ہے، کیوں کہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی صوبہ ایسا ہو جہاں کے دو چار مقامات پر رام کا گذرنا مروی نہ ہو، گوداوری کے قریب بہت دور مشرق کی طرف ہٹا ہوا ایک اور مقام ''پرنا سالہ'' نامی بھی رام کی قیام گاہ بتائی جاتی ہے، پرنا سالہ اور پنچ وتی، یہ دونوں مقام وہ ہیں جہاں سے کہا جاتا ہے کہ راون سیتا کو لے گیا، یہ دعویٰ ان تمام مقامات کی فرضی حیثیت پر روشنی ڈالتا ہے جن کو رام کے سفر وحضر سے منسوب کیا جاتا ہے۔

وین کٹارتنام یہ بھی لکھتے ہیں کہ دسرتھ کی ایک بڑی سلطنت کوشل نامی دریا سے سرجو کے کنارے تک واقع تھی، اس کا دار السلطنت اجودھیا تھا، جس کو خود منو نے آباد کیا تھا، اس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں اور ایک ناقابل عبور خندق اس کی حفاظت کے

لیے تھی، یہاں ایسے ایسے آلات حرب موجود تھے، جو ایک دم سو سو آدمیوں کو ہلاک کر سکتے تھے، کئی محل بہت سی منزلیں اور عمارتیں اس کی رونق تھیں، اجودھیا کا یہ شہر دنیا میں جواب نہ رکھتا تھا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے وین کٹارتنام لکھتے ہیں کہ شہر اجودھیا کی عظمت خوبصورتی اور استحکام کا جو ذکر ہے اس کے لیے گواہی دینے والی ایک اینٹ بھی موجود نہیں، اجودھیا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، ممکن ہے کہ یہاں کچھ بدیسیوں نے آکر نو آبادی قائم کر لی ہو اور اس سے رام کی روایت ملک میں پھیل گئی ہو۔

ڈاکٹر شکلا کا ایک مضمون: یہ باتیں پچاس پہلے لکھی گئی تھیں، جو ممکن ہے کہ آج کل کی تحقیق کے مطابق صحیح ثابت نہ ہوں مگر ابھی حال ہی میں دہلی کے ڈاکٹر آر. ایل. شکلا نے اپنے ایک مضمون میں ایسی باتوں کا انکشاف کیا ہے۔ جس سے راماین اور رام دونوں کی حیثیت مشکوک اور مشتبہ ہو جاتی ہے، وہ لکھتے ہیں: ''راماین میں شروع میں صرف چھ ہزار اشلوک تھے، پھر بارہ ہزار اور آخر میں چوبیس ہزار ہو گئے، یہ آج تک پتہ نہیں چلایا جا سکا ہے کہ کن کن لوگوں کی طرف سے یہ اضافے ہوتے گئے، پھر اشلوک کے ان اضافوں سے تاریخ مرتب کرنا ممکن نہیں، رام چندر جی کا دور مہابھارت سے بہت پہلے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ڈھائی ہزار سال پہلے بتایا جاتا ہے، مہابھارت کی لڑائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک ہزار سال پہلے ہوئی، پھر راماین میں جن جگہوں کا ذکر ہے وہاں انسانی آبادی کا نشان ملنا چاہیے، اس کی تلاش میں اتر پردیش میں تین جگہوں پر کھدائی ہوئی، فیض آباد ضلع میں اجودھیا، پھر الہ آباد سے ۳۵ کلومیٹر اتر کی طرف شرنگویر پور اور پھر الہ آباد شہر میں بھاردواج آشرم میں ہوئی، آج سے تقریباً ۲۵ سال قبل وہاں جو کھدائی ہوئی اس سے وہاں انسانی آبادی کے نشان حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چھ سو سال سے اوپر کے زمانے کے نہیں ملے۔ پھر دس سال پہلے وہاں جو کھدائی ہوئی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سات سو سال پہلے کے

کچھ نشانات ملے، اب اگر یہ مان لیا جائے کہ یہی اجودھیا رام کا شہر تھا اور یہی ان کی جنم بھومی ہے تو رام کا ڈھائی ہزار سال پہلے کا زمانہ اجودھیا کے پتہ چلائے ہوئے آثار سے میل نہیں کھاتا۔

ڈاکٹر شکلا یہ بھی لکھتے ہیں: کہ بودھ کے زمانہ میں اجودھیا میں جو حکومت قائم ہوئی اس کے نشانات کا تو پتہ چلتا ہے مگر اس سے پہلے کی حکومت کے تہذیب اور آثار کا بالکل پتہ نہیں ہے۔ اس لیے جو لوگ اجودھیا میں کسی جگہ کو رام جنم بھومی مانتے ہیں ان کی تائید نہ تو تاریخ اور نہ آثار قدیمہ سے ہوتی ہے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ رامائن کے اجودھیا اور موجودہ اجودھیا میں بڑا فرق ہے، رامائن میں ہے کہ کوشل کا دار السلطنت اجودھیا سرجو ندی کے کنارے پر ضرور تھا مگر ندی سے کافی دور ساڑھے تیرہ میل پر تھا، مگر آج کا اجودھیا ندی سے بالکل قریب ہے، رامائن میں یہ بھی ہے کہ سرجو ندی مغرب کی جانب بہتی ہے اور گنگا سے کچھ دور ہے، مگر آج کل یہ ندی پورب کی جانب بہتی ہے اور یہ راپتی میں نہ کہ گنگا میں جا کر ملتی ہے، ڈاکٹر شکلا نے یہ بھی پورے وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ راون اور رام کی لڑائی کا ثبوت بھی کتبے اور آثار قدیمہ سے نہیں ملتا، وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ رامائن میں ذکر ہے کہ شرنگویر پور میں گنگا پار کر کے رام بھاردواج آشرم گئے، مگر ان دونوں جگہوں کی کھدائی ہو گئی ہے، جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سات سو سال پہلے کی انسانی آبادی کا پتہ نہیں چلتا۔

آخر میں ڈاکٹر شکلا لکھتے ہیں: کہ رام جنم بھومی کو آزاد کرانے کا پروگرام خالص سیاسی اغراض و مقاصد کے تحت شروع کیا گیا ہے، اس طرح نفرت پھیلا کر ان جگہوں کو جہاں مسجدیں موجود ہیں رام جنم بھومی اور اسی قسم کے دوسرے مذہبی دعووں کے ذریعہ ان پر قبضہ کرنے کی مہم ہے۔

السٹریٹڈ ویکلی کا ایک مقالہ: السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا مورخہ ۲۱ر-۱۵ر

جون ۱۹۸۶ء میں چیدا نند داس گپتا کا ایک مضمون نکلا ہے جس میں یہ بیان ہے کہ:

''مورخین کا اس پر اتفاق نہیں، کہ رام چندر جی کہاں پیدا ہوئے؟ اور وہ تو ان کی پیدائش کے پانچ سو برس تک کے حالات کا پتہ نہیں چلا سکتے، ان کو اس سے بھی یہ پریشانی ہے کہ وید میں تو یہ ہے کہ دسرتھ اور رام وارانسی کے راجہ تھے، اس میں ان کو اکسواکو خاندان کا راجہ نہیں بتایا جاتا ہے، دسرتھ جاتکا میں بھی ان کو وارانسی کا راجہ بتایا گیا ہے، اس میں تو یہ بھی ہے کہ سیتا کا کوئی تعلق جنک سے نہ تھا، اگرچہ راماین میں بودھ کا ذکر ہے لیکن بودھ کے زمانہ میں کوشل کا دارالسلطنت اجودھیا نہ تھا بلکہ سراوستی تھا اور پتانجلی کے زمانہ میں ساکیت تھا، پھر راماین میں اجودھیا کا ذکر جس طرح کیا گیا ہے، اس سے تو ظاہر ہے کہ یہ چوتھی صدی قبل مسیح کا شہر نہیں ہو سکتا ہے۔''

اور پھر ان ہی مضمون نگار کا یہ بھی بیان ہے کہ:

''راماین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں یہ رواج تھا کہ چھوٹا بھائی بڑے بھائی کی بیوی کا وارث ہو جاتا تھا، اسی لیے سیتا لکشمن کو یہ طعنہ دیتی ہے کہ وہ اسی لیے رام چندر کے گم ہو جانے پر ان کو تلاش نہیں کرتے اور پھر سیتا رام چندر کو یہ بھی ملامت کرتی ہے کہ وہ سادھوؤں کے جنگل میں مسلح ہو کر آئے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ رام یہاں اس لیے آئے تھے کہ مدھیہ پردیش کے ان غیر آریائی قبیلوں پر فتح پائیں جن کو راکشش کہا جاتا تھا، اس طرح یہ ظاہر ہے کہ راون نے سیتا کا اغوا کر کے اس حملہ کا بدلہ لیا، جو غیر آریائی علاقہ پر کیا گیا تھا، پھر بہت سے

دانشوروں کا یہ خیال ہے کہ لنکا مدھیہ پردیش میں تھا، لنکا سے موجودہ شری لنکا مراد نہیں ہے''۔

آخر میں مضمون نگار نے لکھا ہے کہ:

''اگر رام ایک آئیڈیل فرزند، شوہر اور راجہ تھے، یا لکشمن اور بھرت آئیڈیل بھائی تھے، یا سیتا ایک آئیڈیل بیوی تھیں، تو پھر اس پر زور دینے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ کہاں اور کب پیدا ہوئے، اگر ان کا احترام اس لیے ہے کہ وہ آئیڈیل نمونے تھے تو بھگتی......کے لحاظ سے مؤرخین کی یہ ساری بحثیں بے کار ہیں لیکن یہ سارے واقعات اس طرح سادہ نہیں ہیں، یہ بنیاد پرست کہتے ہیں کہ ہم رام اور سیتا کو آئیڈیل نمونے تسلیم کرنے پر اکتفا نہیں کرتے، ہمارے مہنتوں نے ان کی جو پیدائش کی تاریخ اور پیدائش کی جو جگہ بتائی ہے، ان کو تاریخی حیثیت سے ہم کو تسلیم کرنا ہے اور اسی کے سہارے دوسرے فرقہ سے جنگ کر کے ان سے بازی جیت سکتے ہیں، یہ تسلیم کہ رام کی پیدائش کی جگہ کا ثبوت سائنٹفک طریقہ سے نہیں ملتا ہے لیکن ہم کو اس کی پروا نہیں، بابری مسجد اور رام جنم استھان کے جھگڑے میں جو جذبات ابھرے ہیں، ان کا تقاضا یہ ہے کہ تاریخ کی ساری کتابیں جلا دی جائیں، برہمن اس کی پھر سے تاریخ لکھیں گے، اپنی اس رزمیہ کہانی کو پھر سے سنائیں گے، پھر سے اس کی تعبیر کریں گے اور اس میں طرح طرح کی ایجادات کا بھی اضافہ کریں گے اور وہ اپنے پرانوں کو بھی پھر سے قلم بند کریں گے اور اس کی پروانہ کریں گے کہ تاریخی حیثیت سے ان کا کیا مقام ہے۔

اس دلیل کے بعد پھر سارے معاملات کا تاریخی، قانونی اور اخلاقی جائزہ اور تجزیہ کرنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔

تتمہ: مگر آخر میں یہ کہنا ہے کہ لکھنؤ کی ریاستی اور دہلی کی مرکزی حکومتیں ٹھنڈے طریقہ سے وطن دوستی اور وطن دشمنی، قومی یکجہتی اور قومی پراگندگی، جذباتی ہم آہنگی اور جذباتی بیزاری، روادارانہ نیشنلزم اور جارحانہ نیشنلزم، سیکولرزم اور ٹوٹولی ٹیری ای نزم (Totolitarianism) محبت کی شمیم انگیزی اور نفرت کی شرانگیزی، انصاف اور جبر، خیراندیشی اور بداندیشی میں تفریق کریں اور اپنے ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے جذبات اور احساسات کا لحاظ رکھتے ہوئے منصفانہ، مدبرانہ اور روادارانہ فیصلہ کریں اور یہ فیصلہ ان مطالبات پر مبنی ہونا چاہیے جو پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلی کے منتخب مسلمان اراکین نے اپنے اپنے میمورنڈم میں پیش کیے ہیں، جن کی نقلیں گذشتہ اوراق میں پیش کی جا چکی ہیں۔

ختم شد

BABRI MASJID

rul Musannefin Shibli Academy
Post Box No: 19, Shibli Road
Azamgarh (U.P.) INDIA